۱۶ ستمبر ۲۰۲۶ء | بسم اللہ الرحمن الرحیم | جلد نمبر: ۱۹ ۔ شمارہ نمبر: ۱۸

پندرہ روزہ
معارف فیچر
کراچی
MA'ARIF FEATURE

مدیر:
سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، محمودالحق صدیقی، نوید نون ۔ معاون مدیران: غیاث الدین، م ع فاروقی

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰
فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱_۳۶۳۴۹۸۴۰(۹۲_۲۱)
برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

۱ ۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے، جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔

۲ ۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلاتبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون، نقطۂ نظر، خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں، اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔

۳ ۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

٤ ۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید، لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵ ۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

مصنوعی ذہانت اور فلسطینی بیانیے کی نئی جنگ!

سید عریکات

فلسطین کے مسئلے پر کشمکش اب صرف میدانِ جنگ تک محدود نہیں رہی۔ کئی دہائیوں سے اسرائیل اور اس کے طاقتور سیاسی لابنگ اور تعلقاتِ عامہ کے نیٹ ورک واشنگٹن اور پوری مغربی دنیا میں اس تنازع کے بارے میں رائے عامہ کی تشکیل کے لیے بڑے پیمانے پر وسائل صَرف کرتے رہے ہیں۔ لیکن اسرائیل کی مالی معاونت سے چلنے والی ایک مبینہ مہم کی تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوشش اب ایک نئے اور ممکنہ طور پر زیادہ اہم میدان میں داخل ہو چکی ہے اور یہ میدان مصنوعی ذہانت کے وہ نظام ہیں جنھیں لاکھوں لوگ سچ اور حقیقت کے تعین کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔

حالیہ تحقیقات سے ہینوور انسٹی ٹیوٹ فار پبلک پالیسی نامی ادارے کا انکشاف ہوا، جو بظاہر ایک امریکی تھنک ٹینک ہے، لیکن اس کے کوئی حقیقی دفاتر، قابلِ شناخت ماہرین یا مؤثر ادارہ جاتی وجود سامنے نہیں آیا۔ اس کے بجائے شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ادارہ ایک منظّم پروپیگنڈا آپریشن کے طور پر قائم کیا گیا تھا، جس کا مقصد سرچ انجن کے نتائج کو متاثر کرنا اور مصنوعی ذہانت کے چیٹ بوٹس کے تیار کردہ جوابات پر اثر انداز ہونا تھا۔

امریکی قانون فارن ایجنٹس رجسٹریشن ایکٹ (FARA) کے تحت جمع کرائی گئی دستاویزات سے اس آپریشن کی مالی معاونت کا سلسلہ اشتہارات اور تعلقاتِ عامہ کی کمپنیوں کے ذریعے اسرائیل کے سرکاری اشتہاری ادارے لاپام (LaPam) تک پہنچتا ہے۔ نیویارک کی اشتہاری کمپنی پیرو اِنکارپوریٹڈ (Piro Inc.) اس معاملے میں شامل تھی اور اسرائیلی حکومت سے متعلق ۹ لاکھ ڈالر کے ڈیجیٹل کمیونی کیشن منصوبے کے تحت کام کر رہی تھی۔

اس معاملے کو غیر معمولی بنانے والی بات صرف یہ نہیں کہ اسرائیلی حکومت کی مالی معاونت سے چلنے والی ایک سرگرمی نے عوامی رائے کو متاثر کرنے کی کوشش کی۔ حکومتیں ہمیشہ سے ایسا کرتی آئی ہیں۔ اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ بظاہر یہ کوشش ان مشینوں پر اثر انداز ہونے کے لیے کی گئی جو اَب بتدریج عوامی رائے کی تشکیل میں اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔

رپورٹس کے مطابق صرف نو دنوں میں ہینوور کی ویب سائٹ پر ۱۲۴ علمی طرز کی رپورٹس کی صورت میں پانچ لاکھ ساٹھ ہزار سے زیادہ الفاظ شائع کیے گئے۔ اس مواد کو ان سوالات کے گرد منظّم کیا گیا تھا جو مصنوعی ذہانت کے نظاموں سے پوچھے جانے کا امکان تھا۔ ان میں یہ سوال بھی شامل تھا کہ آیا غزہ میں بھوک کو ایک پالیسی کے طور پر استعمال کیا گیا، اور آیا اسرائیلی فوج ''دنیا کی سب سے زیادہ اخلاقی فوج'' ہے۔

پیرو کمپنی اس طریقۂ کار کو 'اے آئی اسٹوری آپٹیمائزیشن' (AI Story Optimization) کا نام دیتی ہے۔ اس کا مقصد ایسے مواد کی تیاری ہے جو سرچ انجنوں میں زیادہ نمایاں ہو اور بڑے لسانی ماڈلز کے لیے آسانی سے قابلِ فہم اور قابلِ استعمال ہو۔ ویب سائٹ میں ایسی تکنیکی خصوصیات بھی شامل کی گئی تھیں جن سے مصنوعی ذہانت کے نظاموں کے لیے اس مواد کو تلاش کرنا اور اس پر کارروائی کرنا آسان ہو۔

اس طرح مقصد محض قارئین کو قائل کرنا نہیں تھا، بلکہ اُن الگورتھمز پر اثر انداز ہونا بھی تھا جو بتدریج یہ طے کر رہے ہیں کہ قارئین تک کون سی معلومات پہنچنی چاہییے۔

روایتی پروپیگنڈا کو اکثر اس کے ماخذ، لہجے یا واضح سیاسی ایجنڈے سے پہچانا جا سکتا ہے۔ زیادہ جدید اور پیچیدہ پروپیگنڈا اس لیے مشکل سے پہچانا جاتا ہے کہ وہ اپنی حمایت یا جانبداری کو غیر جانبدار علمی مہارت کے پردے میں چھپا دیتا ہے۔ اطلاعات کے مطابق ہینوور کے مواد میں اعداد و شمار، چارٹس اور گراف استعمال کیے گئے، معتبر بنیادی دستاویزات کے حوالے دیے گئے اور علمی تحقیق کی زبان اختیار کی گئی؛ تاہم شواہد کو ایک خاص زاویے سے پیش کیا گیا اور بیرونی ذرائع کے روابط کو محدود رکھا گیا۔

یہی وہ مواد ہے جو مصنوعی ذہانت کے نظام میں شامل ہونے کے بعد مصنوعی اعتبار حاصل کر سکتا ہے۔

ذرا اس کے ممکنہ نتائج پر غور کیجیے۔ ایک طالب علم مصنوعی ذہانت کے چیٹ بوٹ سے پوچھتا ہے کہ آیا اسرائیل نے غزہ میں بھوک کو جنگی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ایک صحافی اسرائیل کے اقدامات کا بین الاقوامی قانون کی روشنی میں جائزہ لینے کے لیے مصنوعی ذہانت سے مدد لیتا ہے۔ ایک

اندرونی صفحات پر

- غزہ سے اسرائیل پر حملے کا پس منظر
- اہلِ غزہ: ابتلا و آزمائش اور ہماری چشم پوشی
- مکہ معاہدہ اور بنگلا دیش
- نیپال: ہمالیائی خطے کو قدرت کی تنبیہ
- کشمیر: آئینی تغیرات، جمہوری تعطل اور پسپائی!
- بچوں کی عادت سازی میں والدین کا کردار

ووٹر اسرائیل اور فلسطین کے تنازع کی غیر جانبدار وضاحت حاصل کرنا چاہتا ہے۔

اگر ایک فرضی تحقیقی ادارہ کامیابی سے اپنے مواد کو معلوماتی نظام میں داخل کر چکا ہو تو مصنوعی ذہانت سے تیار ہونے والا جواب اس ادارے کے پیش کردہ زاویۂ نظر کو دہرا سکتا ہے، جبکہ صارف کو یہ علم بھی نہیں ہوگا کہ اس معلومات کا ماخذ دراصل ایک مصنوعی ادارہ تھا۔

یہ خطرہ محض نظری نہیں ہے۔ پولیٹیکو کی جانب سے کیے گئے تجربات میں چیٹ جی پی ٹی اور پرپلیکسیٹی (Perplexity) دونوں نے غزہ، صہیونیت مخالف رجحانات اور یہود دشمنی سے متعلق غیر جانبدار سوالات کے جوابات دیتے ہوئے ہینوور کے مواد کا حوالہ دیا۔

مشین لازماً یہ نہیں سمجھ سکتی کہ بظاہر معتبر نظر آنے والا کوئی ادارہ دراصل فرضی ہے۔ اسے صرف متن، حوالہ جات، اعداد وشمار اور بار بار دہرائے جانے والے دعوے نظر آتے ہیں۔ اگر ان مواد کو جان بوجھ کر اس طرح تیار کیا گیا ہو کہ وہ آسانی سے تلاش کیے جائیں اور مصنوعی ذہانت کے نظام انہیں آسانی سے اپنے جوابات میں شامل کر سکیں تو پروپیگنڈا آزاد اور غیر جانبدار علم کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔

کئی برسوں سے اسرائیل اور اس کے حامی فلسطینیوں کے بارے میں گفتگو کے لیے استعمال ہونے والی اصطلاحات اور فریم ورک پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ ''سلامتی''، ''دہشت گردی''، ''اپنا دفاع'' اور اسرائیل کے وجود کے حق جیسے تصورات اکثر گفتگو پر غالب رہے ہیں، جبکہ قبضہ، یہودی آبادکاری میں توسیع، بے دخلی، محاصرہ اور فلسطینیوں کے حقِ خود ارادیت جیسے موضوعات کو اسی درجے کی سیاسی اہمیت حاصل نہیں ہو سکی۔

ابتدائی ڈیجیٹل دَور میں ایسا محسوس ہوا کہ فلسطینی روایتی اطلاعاتی ذرائع کے اثر سے نکلنے کا ایک راستہ حاصل کر رہے ہیں۔ سوشل میڈیا، آزاد صحافت اور خود فلسطینیوں کی جانب سے غزہ اور مقبوضہ علاقوں سے بنائی گئی ویڈیوز نے دنیا بھر کے لوگوں تک معلومات پہنچانے کا موقع فراہم کیا، اور ان معلومات کو روایتی میڈیا کے ذریعے گزرنا ضروری نہیں تھا۔

اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ردِعمل ایک اور گہرے مرحلے میں داخل ہو رہا ہے: صرف یہ طے کرنے تک محدود نہیں کہ لوگ کیا دیکھیں، بلکہ ان نظاموں پر بھی اثر انداز ہونے کی کوشش کہ وہ لوگوں کو کون سی معلومات فراہم کریں۔

یہ بیانیے کی جنگ کی کہیں زیادہ وسیع اور منظّم شکل ہے۔

FARA کے تحت سامنے آنے والی دستاویزات بھی اہم ہیں کہ وہ واضح کرتی ہیں کہ شفافیت کے تقاضے کیوں ضروری ہیں۔ تحقیقات کے مطابق ہینوور آپریشن کا سراغ پیرو کی جانب سے جمع کرائی گئی دستاویزات کے ذریعے ملا، جن میں ادارے کی ویب سائٹ پر کیے جانے والے کام کی تفصیلات موجود تھیں۔ یہ سلسلہ ہاواس میڈیا کے جرمن شعبے تک پہنچا، جو مبینہ طور پر اسرائیلی حکومت کے ایک بڑے اکاؤنٹ کو بھی سنبھال رہا تھا، اور بالآخر اسرائیل کے سرکاری اشتہاری ادارے لاپام تک جا پہنچا۔

دستاویزی ریکارڈ اس لیے اہم ہے کہ جب غیر ملکی اثر اندازی کو ایک آزاد امریکی علمی ادارے کی شکل میں پیش کیا جائے تو اس کی نوعیت زیادہ خطرناک ہو سکتی ہے۔ امریکی شہریوں کو یہ جاننے کا حق حاصل ہے کہ بظاہر غیر جانبدار نظر آنے والی کوئی تحقیقی تنظیم دراصل کسی غیر ملکی حکومت کی ابلاغی حکمتِ عملی کا حصہ ہے یا نہیں۔

مصنوعی ذہانت کے نظاموں کے پاس حقیقت تک رسائی کی کوئی آزاد اور براہِ راست کھڑکی نہیں ہوتی۔ وہ ان معلوماتی ماحول پر انحصار کرتے ہیں جو انسانوں نے تشکیل دیا ہے۔ اگر حکومتیں، کارپوریشنیں یا سیاسی تنظیمیں جان بوجھ کر ایسے مواد سے ان معلوماتی ذرائع کو بھر دیں جو مخصوص حکمتِ عملی کے تحت تیار کیا گیا ہو، تو وہ ان معلومات پر اثر انداز ہو سکتی ہیں جن کی بنیاد پر مصنوعی ذہانت اپنے جوابات تیار کرتی ہے۔

فلسطین اس مسئلے کو سمجھنے کے لیے ایک خاص طور پر اہم مثال ہے، کیونکہ یہ تنازع پہلے ہی ایک انتہائی متنازع اور کشیدہ اطلاعاتی ماحول میں جاری ہے۔ اس کے تاریخی اور دستاویزی ریکارڈ میں کئی دہائیوں کا قبضہ، یہودی بستیاں، نقل مکانی، جنگیں، پابندیاں، انسانی بحران، سفارتی اقدامات اور بین الاقوامی تحقیقات شامل ہیں۔

ایک قابلِ اعتماد معلوماتی نظام کو صارفین کے سامنے اس پیچیدگی کے مختلف پہلو پیش کرنے چاہئیں۔ اس کے برعکس ایک منظّم پروپیگنڈا کا نظام اس پیچیدگی کو اپنے مطلوبہ انداز میں ترتیب دینے کی کوشش کرتا ہے۔

اسی لیے ہینوور کا معاملہ صرف اسرائیل اور فلسطین کے تنازع پر نظر رکھنے والے لوگوں کے لیے تشویش کا باعث نہیں ہونا چاہیے۔ اگر آج کوئی غیر ملکی حکومت یا اس کے ٹھیکیدار مصنوعی ذہانت کے نظاموں پر اثر انداز ہونے کے لیے ایک فرضی تھنک ٹینک قائم کر سکتے ہیں تو کل دوسری حکومتیں، سیاسی مہمات، کارپوریشنیں اور دولت مند مفاداتی گروہ بھی اسی نوعیت کی کوششیں کر سکتے ہیں۔

البتہ اسرائیل کے مبینہ کردار کی اہمیت اس لیے نمایاں ہو جاتی ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک محض سیاسی لابنگ اور تعلقاتِ عامہ کا نظام نئی تکنیکی صورتِ حال کے مطابق خود کو کس طرح ڈھال سکتا ہے۔ اب یہ جنگ صرف کانگریس، ٹیلی وژن نیٹ ورکس، اخبارات، جامعات یا سوشل میڈیا تک محدود نہیں رہی۔

اب مصنوعی ذہانت تیار کرنے والی کمپنیوں کے سامنے ایک نہایت اہم سوال ہے:

آخر مشینوں کو یہ کون سکھا رہا ہے کہ ہمیں فلسطین کے بارے میں کیا بتانا ہے۔۔۔اور دنیا کے بارے میں کیا بتانا ہے؟

مصنوعی ذہانت تیار کرنے والے اداروں کو منظّم اثر اندازی کی کارروائیوں، فرضی اداروں اور مصنوعی طور پر تیار کیے گئے تحقیقی مواد کے خلاف زیادہ مضبوط حفاظتی نظام قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ سرچ انجنوں کو بھی اپنی صلاحیت بہتر بنانی چاہیے تاکہ وہ حقیقی ادارہ جاتی مہارت اور ایسے ویب صفحات میں فرق کر سکیں جو بنیادی طور پر الگورتھمز کو متاثر کرنے کے لیے تیار کیے گئے ہوں۔

صحافیوں اور ماہرینِ تعلیم کو بھی ایسے بظاہر معتبر ذرائع کی جانچ پڑتال کرنی چاہیے جن کی حقیقی ادارہ جاتی بنیاد قابلِ تصدیق نہ ہو۔ حکومتوں کو بھی اس وقت غیر ملکی ایجنٹوں سے متعلق افشا اور رجسٹریشن کے قوانین پر مؤثر عمل درآمد یقینی بنانا چاہیے۔

سب سے بڑھ کر صارفین کو یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ مصنوعی ذہانت سے تیار ہونے والا جواب لازماً ایک آزاد اور غیر جانبدار تجزیہ نہیں ہوتا۔ یہ ان معلومات کی عکاسی کرتا ہے جو اس نظام کو دستیاب ہوتی ہیں اور ان معلومات کو جان بوجھ کر ایک خاص مقصد کے لیے ترتیب دیا جا سکتا ہے۔

لہٰذا ہینوور کی تحقیقات کو اسرائیل کی ساکھ کے لیے جاری طویل جدوجہد کے ایک اور واقعے کے طور پر دیکھنے سے زیادہ اہم یہ ہے کہ اسے فلسطین کے مستقبل سے متعلق ایک انتباہ کے طور پر سمجھا جائے۔

کئی دہائیوں سے اسرائیل اور اس کے حامی فلسطینیوں کے بارے میں بیانیے کو سیاست، لابنگ، سفارت کاری اور تعلقاتِ عامہ کے ذریعے تشکیل دینے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔

باقی صفحہ نمبر ۱۳

غزہ سے اسرائیل پر حملے کا پسِ منظر

Shlomi Eldar and Ruth Yuval

یہ ستمبر ۲۰۲۳ء کے آخری ایام کی بات ہے۔ مغربی کنارے میں تشدد کا گراف بلند ہو چکا تھا۔ غزہ کے عوام سرحدی باڑ پر احتجاج کر رہے تھے۔ اسرائیل عدالتی اصلاحات کے قوانین پر اندرونی تنازعات کا شکار تھا۔

متحدہ عرب امارات کے صدر شیخ محمد بن زاید خاص طور پر فکرمند تھے۔ اسرائیل کے صدر اسحاق ہرزوگ نے بتایا کہ جنگ سے مہینوں پہلے انہوں نے مجھ سے بات کی۔ وہ مسلسل پیغام پہنچاتے رہے کہ صورتِ حال کو معقول حد تک پُرسکون کرنے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے ایک ایلچی بھی اسرائیل بھیجا جس نے وزیراعظم بن یامین نیتن یاہو سے ملاقات کی۔

بن زاید براہ راست وزیراعظم نیتن یاہو سے بھی بات کرتے تھے۔ یہ بات چیت ایک طے شدہ طریقِ کار کے تحت ہوتی تھی۔ اماراتی سفارت خانے کا ایک نمائندہ وزیراعظم کے دفتر آتا اور ایک مخصوص فون ڈیوائس لاتا جو کال کی رازداری کو یقینی بناتی تھی۔

لیکن اس بار بن زاید کی طرف سے کی گئی یہ کال غیر معمولی تھی۔ ۷؍اکتوبر ۲۰۲۳ء سے تقریباً ایک ہفتہ پہلے اماراتی حکمران نے ابوظہبی کے صدارتی محل سے نیتن یاہو کو فون کیا اور ۴۵ منٹ تک ان سے بات کی۔ محمد بن زاید نے خبردار کیا کہ غزہ میں حماس کے رہنما یحیٰی سنوار اسرائیل کے خلاف ایک بڑے آپریشن کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔ بن زاید نے خدشہ ظاہر کیا کہ یہ عسکری آپریشن پورے خطے میں خون خرابے اور عدمِ استحکام کا باعث بنے گا۔

اس کال کے دوران بن زاید کے ایک قریبی مشیر بھی موجود تھے جو فلسطینی ہیں۔ یو اے ای کے سربراہ نے نیتن یاہو کو الرٹ رہنے کا مشورہ دیا۔ نیتن یاہو اُن کی بات پر زیادہ سنجیدہ دکھائی نہیں دیے۔ ان کا خیال تھا کہ حماس نے مغربی کنارے کے علاقے میں کچھ کرنے کی تیاری کی ہے۔

اماراتی حکمران نے بعد میں نیتن یاہو کے ساتھ ہونے والی بات چیت اور امریکی خفیہ ادارے سی آئی اے کے ڈائریکٹر ولیم جے برنز کو دی گئی وارننگ کا بھی ذکر کیا۔ بن زاید نے برنز کو بتایا کہ انہوں نے نیتن یاہو کو یہ احساس دلانے کی کوشش کی تھی کہ ''وہاں کچھ پھٹنے والا ہے'' اور انہیں بتایا کہ اسرائیلی وزیراعظم کا ماننا تھا کہ نازک علاقہ دراصل مغربی کنارہ ہے۔

کسی نے بھی یہ نہ سوچا تھا کہ اسرائیلی وزیراعظم پیغام سنیں گے لیکن دفاعی ادارے کے سربراہوں کو اس سے آگاہ نہیں کریں گے۔ اسرائیل کے داخلی خفیہ ادارے شن بیت (Shin Bet) کے سربراہ، موساد کے سربراہ، اسرائیلی افواج کے چیف آف اسٹاف۔۔۔ ان میں سے کسی کو بھی بن زاید کی وارننگ کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔

اسرائیل کے حماس سے رابطے ستمبر ۲۰۲۳ء کے اوائل میں خفیہ طور پر شروع ہوئے جو نیتن یاہو کی انتہائی دائیں بازو کی حکومت کے قیام کے ساتھ ہم آہنگ تھے۔ سنوار نے حماس کے سیاسی بیورو کے رکن غازی حماد کو اس مشن کے لیے مقرر کیا۔ حماد عبرانی زبان روانی سے بولتے ہیں اور مغوی سپاہی گیلاد شالت کی رہائی کے خفیہ رابطوں میں شامل تھے۔ اسی وقت فتح کے ایک سینئر اہلکار کو بھی شامل کیا گیا جو عبرانی روانی سے بولتے تھے۔

بات چیت براہِ راست تھی۔ غازی حماد اور ''کول آئز'' نامی رابطہ کار غزہ میں ناصر سراج کے گھر بیٹھتے تھے جو فلسطینی اتھارٹی کی شہری امور کی وزارت کے ڈپٹی ڈائریکٹر کے طور پر خدمات انجام دے چکے تھے۔ اسرائیلی جانب لائن پر شن بیت کے وہ اہلکار موجود تھے جو یرغمالیوں اور مفقود الخبر افراد کے ذمہ دار تھے۔

غزہ میں بدامنی مصر کو بھی نقصان پہنچا سکتی تھی اس لیے ان مذاکرات کا ایک بڑا حصہ مقبوضہ بیت المقدس اور قاہرہ کے درمیان پہلے سے طے شدہ معاہدوں پر مبنی تھا۔ اس کے باوجود، براہ راست چینل کو مصریوں سے چھپایا گیا تھا۔

غزہ کے باشندوں کے لیے ہزاروں ملازمتوں کی فراہمی کا معاملہ بھی زیرِ غور تھا۔ مصر غزہ کے رہائشیوں کو شرم الشیخ کے ہوائی اڈے تک جانے کے لیے محفوظ راستہ دینے کو بھی تیار تھا۔ غزہ میرین قدرتی گیس فیلڈ سے غزہ کو قدرتی گیس فراہم کرنے کی تجاویز بھی پیش کی گئیں جو ۲۰۰۰ء میں اس علاقے کے ساحل کے قریب دریافت ہوئی تھی۔ اس تجویز کو G4G یعنی گیس برائے غزہ کا نام دیا گیا تھا۔

۲۰۲۳ء کی گرمیوں تک ایسا لگتا تھا کہ تمام معاشی امور طے پا گئے ہیں اور صرف سب سے حساس مسئلہ ایجنڈے پر رہ گیا تھا۔۔۔ غزہ سے اسرائیلی قیدیوں اور سپاہیوں کی لاشوں کی بازیابی۔ یحیٰ سنوار نے اویرا مینگسٹو اور ہشام السید کی واپسی اور ہدار گولڈن اور اورون شاؤل کی لاشوں کے بدلے حماس کے ۵۰۰ قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ بعد میں یہ تعداد ۲۵۰ کردی گئی۔ جان گُسل مذاکرات کے بعد حماس صرف ۵۰ قیدیوں کی رہائی پر بھی متفق ہو گئی۔ شن بیت نے چار اسرائیلیوں کی واپسی کے بدلے ۳۰ قیدیوں کی رہائی قبول کرنے کا میلان ظاہر کیا جن میں سے ۲۰ عمر قید کاٹ رہے تھے۔

اب وزارتی کمیٹی کی منظوری درکار تھی جس کی رضامندی قیدیوں کی رہائی کے لیے ضروری ہے تاہم نیتن یاہو نے کمیٹی کا اجلاس بار بار ملتوی کیا۔ شاید انہوں نے حماس کے ساتھ معاہدہ تک پہنچنے کے ڈر سے ایسا کیا۔ یا پھر شاید اپنی نئی حکومت میں اپنے انتہا پسند اتحادیوں کے ردِعمل کے خوف سے۔

جب سنوار نے پیشرفت نہ ہونے پر ناراضی کا اظہار کرنا شروع کیا تو غازی حماد اور کول آئز نے انہیں یہ کہہ کر تسلی دینے کی کوشش کی کہ تاخیر کا سبب یہ ہے کہ اسرائیلی حکومت اندرونی معاملات میں الجھی ہوئی ہے۔

اسرائیل میں جاری اندرونی افراتفری پر ایران، حماس اور حزب اللہ کے مزاحمتی محور کے اندر یہ تاثر پیدا ہوا کہ اسرائیل بہت زیادہ کمزور ہو چکا ہے اور وہ محاذوں کو متحد کر کے اسے شکست دینے کے لیے ایک مربوط مہم شروع کر سکتے ہیں۔ حماس نے ایران سے رابطے بڑھا لیے۔ ستمبر ۲۰۲۳ء کے اوائل میں سنوار نے مذاکراتی ٹیم سے تمام رابطے منقطع کر دیے۔ یوں شن بیت کے اہلکار اور حماس کے اہلکار غازی حماد کے درمیان نیتن یاہو کی منظوری سے قائم ہونے والا بلاواسطہ چینل منقطع ہو گیا۔ یہ چینل ۷؍اکتوبر کے قتلِ عام کے ایک سال بعد ستمبر ۲۰۲۴ء میں مکمل طور پر دوبارہ فعال ہوا جب یرغمالیوں کے تعطل کا شکار معاہدے طے کرنے کی اشد ضرورت پیش آئی۔

ستمبر ۲۰۲۳ء میں فیصلہ کن وقت سے ٹھیک پہلے سنوار نے فتح کے اہلکار کول آئز کے ساتھ ایک نجی ملاقات کا اہتمام کیا۔ انہوں نے کہا کہ اسرائیلیوں کو بتاؤ اگر وہ پیشرفت نہیں کرتے تو میں ان کے لیے ایک بڑا سرپرائز تیار کر رہا ہوں۔

کول آئز اس گفتگو سے دہل کر رہ گیا۔ اس نے اپنے ایک قریبی دوست سے مشورہ کرنے کا فیصلہ کیا جو وہی فلسطینی تھا جو غزہ سے ابوظہبی منتقل ہوا تھا اور شیخ محمد بن زاید کے قریبی

مشیر کے طور پر خدمات انجام دے رہا تھا۔ کول آئیز کو ڈر تھا کہ اُس پر سنوار کے لیے کام کرنے کا الزام آ سکتا ہے۔

یو اے ای کے سربراہ کو سرپرائز سے متعلق پیغام ملا تو وہ متفکر ہوئے۔ وہ جانتے تھے کہ حماس نے کوئی بڑا حملہ کیا تو جنگ کی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے۔

دوسری طرف سنوار چاہتے تھے کہ ان کا پیغام اسرائیل کو ملے مگر ایسا نہ ہوا۔ انہوں نے ثالث سے پوچھا تو جواب نفی میں ملا۔ سنوار نے کہا کہ اب یہ پیغام دو کہ میں بہت بڑے سرپرائز کی تیاری کر رہا ہوں۔ کول آئز اور شیخ محمد بن زاید کے مشیر کو یقین ہو گیا کہ کچھ بہت بڑا اور برا ہونے والا ہے۔ انہوں نے ملاقات کی جس میں معاملات کا جائزہ لیا گیا تاکہ متعلقین تک بات پہنچائی جا سکے۔ انہیں پورا یقین تھا کہ سنوار جنگ میں جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔

۱۵ ستمبر کو کول آئز اور مشیر نے شن بیت کو وارننگ پہنچا دی۔ شن بیت کے سربراہ رونین بار نے وزیرِاعظم سے فون کی درخواست کی۔ نیتن یاہو کے ملٹری سیکرٹری آوی گل نے کال کا اہتمام کیا۔ نیتن یاہو نے اس وارننگ کے بارے میں اپنے مشیروں سے بات کی تو انہوں نے خیال ظاہر کیا کہ سنوار مذاکرات میں پیشرفت کے لیے دباؤ ڈال رہے ہیں، بس۔

بہرحال، دفاعی ادارے نے کوئی غیر ضروری خطرہ نہیں لیا۔ سکیورٹی اجلاس دو دن بعد، ۱۷ ستمبر کو ہوا، جس میں وزیرِ دفاع یوآو گیلانٹ اور ملٹری انٹیلی جنس کے نمائندوں نے شرکت کی۔ اجلاس کے بعد اسی دن وزیرِاعظم کے دفتر میں ایک ورکنگ میٹنگ منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ موساد اور نیشنل سکیورٹی کونسل کے نمائندوں کو بھی مدعو کیا گیا۔ اجلاس میں شن بیت کے نمائندوں نے، نئے انٹیلی جنس مواد کا تقابلی جائزہ لے کر اندازہ لگایا کہ سنوار عراق میں قید اسرائیلی محقق الزبتھ تسورکوف کو حاصل کرنے کی منصوبہ سازی کر رہے ہوں گے تاکہ وہ تبادلے کے معاہدے میں فلسطینی قیدیوں کی تعداد بڑھا سکیں۔

یہ دیکھتے ہوئے کہ اسرائیل شن بیت کو بھیجی گئی واضح وارننگ پر کوئی ردِعمل نہیں دے رہا، اماراتی حکمران نے خود اسرائیل کے وزیرِاعظم سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح ستمبر کے آخر میں ۴۵ منٹ کی وہ گفتگو ہوئی جس میں انہوں نے نیتن یاہو کو سنوار کے ارادوں کے بارے میں صریح وارننگ دی۔

اسی طرح کی ایک کال ان دنوں مصری انٹیلی جنس چیف جنرل عباس کامل کی طرف سے بھی وزیرِاعظم کے دفتر پہنچی جنہوں نے نیتن یاہو کو حماس کی طرف سے شروع کیے جانے والے ’’کسی غیر معمولی، خوفناک آپریشن‘‘ کے بارے میں خبردار کیا تھا۔ صحافی سمدار پیری، جنہوں نے اسرائیلی اخبار یدیعوت احرونوت میں اس گفتگو کی تفصیلات شائع کی تھیں، بتاتی ہیں کہ نیتن یاہو نے کامل سے یہ بھی کہا تھا غزہ میں معاملات ہمارے ہاتھ میں ہیں۔ ہمارا مسئلہ مغربی کنارہ ہے۔

یکم اکتوبر کو شن بیت کے سربراہ نے سنوار سمیت حماس کے اعلیٰ ترین عہدیداروں کو نشانہ بنانے کی سفارش کی۔ میٹنگ کے دوران نیتن یاہو نے ان وارننگ فون کالز کا کوئی ذکر نہیں کیا جو انہیں موصول ہوئی تھیں۔

انٹیلی جنس کے ایک سینئر اہلکار نے، جو سنوار کو اچھی طرح جانتے اور سمجھتے تھے، کہا کہ ابتدائی مرحلے سے، شاید جیل میں بھی، سنوار کے ذہن میں دو متبادل تھے۔ ایک طرف انہوں نے حماس کی فوجی صلاحیتوں کی ترقی کو تیز کیا اور اسے ایک طاقتور فورس میں تبدیل کیا۔ وہ غزہ کے حالات بہتر بنانا چاہتے تھے اور اس کے لیے کوئی بھی قیمت چکانے کو تیار تھے۔

معاملہ یہ تھا کہ حماس اور اسرائیل کے درمیان قیدیوں کے تبادلے اور لاشوں کی حوالگی کے حوالے سے مذاکرات غیر معمولی طول پکڑ گئے تھے۔ معاملات زیادہ وقت زیرِ التوا رہتے تھے۔ یہ سب کچھ حماس کو ناقابلِ قبول لگتا تھا۔ سنوار بھی اِس کے لیے فوری تبدیلی، بلکہ پیشرفت چاہتے تھے۔ اسرائیلی وزیرِاعظم کا تذبذب نمایاں تھا۔ وہ اس بات سے ڈر رہے تھے کہ کہیں کوئی ایسی غلطی سرزد نہ ہو جائے جس کے نتیجے میں معاملات مزید خرابی کی طرف جائیں اور ایک بار پھر تصادم کی فضا پیدا ہو۔ جب سکیورٹی ایجنسیوں نے حماس کی طرف سے شدید آپریشنل سرگرمیوں کی نشاندہی کی تو نیتن یاہو نے ان کے خلاف ایک طاقتور آپریشن شروع کرنے کی اجازت دینے سے بار بار انکار کیا۔

اسرائیلی فوج کے سابق میجر جنرل گواہی دیتے ہیں کہ انہوں نے ایک سے زیادہ بار چیف آف اسٹاف ہرزی حالیوی کو نیتن یاہو کی روک تھام کی پالیسی پر تنقید کرتے ہوئے سنا۔ وہ میٹنگوں میں اس کی واضح الفاظ میں وضاحت کرتے تھے۔ یہ گھر میں دیوار سے نکلی ہوئی کیل کی طرح ہے۔ اسے نکالنے کے بجائے آپ بچوں سمیت خاندان کے تمام افراد کو جمع کرتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں جب بھی آپ یہاں سے گزریں کیل سے ہوشیار رہیں۔ جب ہم کیل کے ساتھ رہنے پر رضامند ہوئے تو ہم یہ نہیں سمجھے تھے کہ آخر میں جو کچھ ہوگا، وہ یہ ہے کہ اسے دیوار سے ہٹانے کے بجائے ہم خود اِس سُولی پر لٹک جائیں گے۔

پھر کووڈ کی وبا پھوٹ پڑی اور حماس اور اسرائیل کے درمیان رابطے منقطع ہو گئے۔ اسرائیل نے وبائی مرض کی لائی گئی نئی مشکلات سے نپٹنے پر توجہ مرکوز کی۔ اسرائیل کو کمزوری کی حالت میں کوئی ایک غلط فیصلہ شدید نقصان پہنچا سکتا تھا۔

۷/اکتوبر کو صبح ساڑھے چھ بجے ’’زلزلہ‘‘ آ گیا۔ دوپہر تک، اسرائیل اور دنیا بھر کے سوشل میڈیا پر قتلِ عام کی خوفناک وڈیوز کا سیلاب آ چکا تھا۔ قتل، آتش زنی اور تباہی کی درجنوں وڈیوز میں اسرائیلی شہریوں کو غزہ کی پٹی میں اغوا ہوتے دکھایا گیا۔

جب اسرائیلی سکیورٹی کابینہ کا اجلاس ہوا تب تک یہ واضح نہیں تھا کہ کتنے اسرائیلیوں کو اغوا کیا گیا ہے۔ شن بیت کے سربراہ نے کہا ’’فی الحال ۱۴ فوجی اور ۲۸ شہری یرغمال ہیں، اور درجنوں مزید ہیں جن سے کوئی رابطہ نہیں ہوا ہے۔‘‘ وزیرِ داخلہ کا کہنا تھا کہ فوج کو مذاکرات نہیں کرنے چاہئیں۔ وزیرِ دفاع یوآو گیلانٹ نے اعلان کیا ’’وہ ہم سے صرف تب بات کریں گے جب وہ زمین پر ہوں گے اور ان کے سر پانی کے نیچے ہوں گے۔‘‘

شام تک دنیا سو سے زائد افراد کے اغوا کی خوفناک معلومات حاصل کر چکی تھی۔ شام ۷ بجے قطر کے وزیرِاعظم شیخ محمد بن عبدالرحمٰن آل ثانی نے موساد کے ڈائریکٹر ڈیوڈ برنیا کو فون کیا جن سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے۔ ایک ہفتہ پہلے ہی ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ برنیا نے اس وقت نیتن یاہو کی طرف سے دوحہ کا سفر کیا تھا تاکہ قطریوں سے غزہ کی پٹی کے لیے مالی امداد بڑھانے کی درخواست کی جا سکے۔

آل ثانی پریشان تھے۔ ’’میں نے ابھی حماس کے سیاسی رہنما اسماعیل ہنیہ اور ان کے نائب خلیل الحیہ کے ساتھ بات چیت ختم کی ہے جو دوحہ پہنچے ہیں۔‘‘ انہوں نے برنیا کو بریفنگ دی۔ ’’میں نے انہیں واضح طور پر دھمکی دی کہ اگر تمام شہری یرغمالیوں کو فوری طور پر رہا نہ کیا گیا تو میں ذاتی طور پر انہیں قطر سے نکالنے کا حکم دوں گا۔ حماس نے کہا کہ وہ تمام شہریوں کو رہا کرنے کے لیے تیار ہے اور ہم ثالثی کے لیے تیار ہیں۔‘‘

اسرائیلی موساد کے ڈائریکٹر کے ردِعمل نے آل ثانی کو الجھن میں ڈال دیا ’’اگر وہ شہریوں کو رہا کرنا چاہتے ہیں تو انہیں رہا کرنے دیں۔ ہم حماس سے بات کرنے کے لیے تیار نہیں۔‘‘

قطری وزیرِاعظم نے امریکی وزیرِ خارجہ انٹونی بلنکن کو فون کیا اور کہا ’’یرغمالیوں کو چھوڑے جانے پر بھی اسرائیلی

مذاکرات کے لیے تیار نہیں۔“

بلنکن نے قطری وزیرِاعظم کو بتایا کہ وہ تین دن میں اسرائیل جانے والے ہیں۔ تب تک انتظار کیا جائے۔ قطری وزیرِاعظم نے کہا میں اس سلسلے میں نیتن یاہو سے خود بات کروں گا۔ بلنکن نے انہیں روکا اور کہا کہ صورتِ حال پیچیدہ ہے۔ یہ وقت نیتن یاہو سے بات کرنے کا نہیں۔ ہم تین دن انتظار کریں گے۔

اگلی صبح، اسرائیل اور دوحہ کے درمیان سفارتی بات چیت سے دور، سنوار کے دائیں ہاتھ راوہی مشتہا نے دحلان کے ساتھی سمیر مشہراوی کو فون کیا۔ مشتہا نے سنوار کی طرف سے دحلان سے درخواست کی کہ وہ ان کی ایک ثالث تلاش کرنے میں جلدی سے مدد کریں تاکہ جنگ بندی کا معاہدہ کیا جاسکے۔

مشہراوی نے دحلان کو اس کال کی اطلاع دی۔ ان کے مطابق دحلان نے ان سے کہا کہ ”سب سے پہلے اور اہم بات یہ ہے کہ انہیں تمام شہریوں، بچوں، بوڑھوں اور بچوں کو رہا کردینا چاہیے۔ اس کے بغیر بات کرنے کے لیے کچھ نہیں۔ انہوں نے جو کیا وہ پاگل پن تھا۔ انہوں نے ریڈ لائن نہیں، بلیک لائن پار کی۔ اگر شہریوں کو رہا کردیا جاتا ہے تو اسرائیلی عوام میں یہ احساس پیدا ہوگا کہ بات چیت کے لیے کچھ ہے۔ اگر نہیں، تو جو انہوں نے پکایا ہے وہی کھائیں۔“

مشہراوی نے دحلان کا پیغام حماس تک پہنچایا۔ مشتہا نے کہا ”مجھے ۲۴ گھنٹے دیں جس کے بعد میں میں آپ کو جواب دوں گا۔“ حیران کن طور پر وہ صرف ایک گھنٹے بعد لوٹ آئے۔ ان کے پاس ایک پیغام تھا۔۔۔ یہ کہ سنوار تمام شہریوں کو رہا کرنے کے لیے تیار تھے مگر صرف ۱۸/سال سے کم کے یا پھر ۵۰ سال سے زائد کے۔

دحلان نے شن بیت سے رابطوں کو متحرک کیا اور ان تک یہ معلومات پہنچائیں۔ مشہراوی کے مطابق ”غیر سرکاری ردِعمل جو دحلان کو ان سے موصول ہوا، وہ یہ تھا کہ نیتن یاہو کسی بھی چیز کے بارے میں بات نہیں کرنا چاہتے۔ وہ صرف جنگ چاہتے ہیں تاکہ حماس کا خاتمہ ہو۔ اسرائیلیوں کا بظاہر یہ عزم تھا کہ حماس کو ختم کرکے طاقت کے ذریعے یرغمالیوں کو واپس لایا جائے گا۔“

وزارتِ دفاع کے ایک سینئر اہلکار کا اعتراف ہے کہ شہری یرغمالیوں کی رہائی کی کم ازکم کچھ تجاویز موساد، شین بیت اور وزیرِاعظم تک پہنچی تھیں لیکن اگر وہ ٹھوس بھی تھیں تو بھی ملٹری اسٹیبلشمنٹ، جسے صورتِ حال پر کنٹرول حاصل کرنے کے لیے ۲۴ گھنٹے درکار تھے، اور اس سے بھی زیادہ سکتے میں آئی ہوئی سیاسی قیادت پہلے چند دنوں میں اس معاملے پر بحث کرنے سے قاصر تھی۔

سینئر اہلکار کہتے ہیں ”سچی بات تو یہ ہے کہ یرغمالیوں کا مسئلہ اس مرحلے پر ایجنڈے پر سنجیدگی کے ساتھ نہیں تھا۔ یرغمالیوں کی رہائی ۷/اکتوبر کی رات کو حکومت کی طرف سے ترتیب دیے گئے جنگی اہداف کی فہرست میں بھی شامل نہیں تھی۔“

مشہراوی بتاتے ہیں کہ ۱۰/اکتوبر کو مشتہا نے سنوار کی طرف سے انہیں دوبارہ فون کیا تاکہ یہ معلوم کیا جاسکے کہ آیا حماس کی تجویز پر کوئی اسرائیلی ردِعمل موصول ہوا ہے۔ مشہراوی کہتے ہیں ”میں نے ان سے کہا میں اب بھی اسرائیل کے ردِعمل کا منتظر ہوں۔ میں نے جواب کے لیے کچھ اور دن انتظار کیا، اور میں نے دوبارہ اسرائیلیوں سے رابطہ کیا، لیکن وہ بات کرنے کی حالت میں بالکل بھی نہیں تھے۔ دریں اثناء، چند دنوں کے اندر، غزہ میں بمباری میں شدت آگئی اور مشتہا اور سنوار سے رابطہ ناممکن ہوگیا۔“

بلنکن بالآخر پانچ دن بعد اسرائیل پہنچے۔ جمعرات ۱۲/اکتوبر کو اپنی آمد کے فوراً بعد انہوں نے نیتن یاہو سے ملاقات کی اور اگلے دن وہ قطر کے وزیرِاعظم سے ملاقات کے لیے دوحہ چلے گئے۔ امریکی وزیرِ خارجہ نے آل ثانی کو بتایا ”میں نے نیتن یاہو سے گفتگو میں یرغمالیوں کی رہائی کا معاملہ اٹھایا مگر مجھے اُن کی طرف سے کوئی واضح جواب نہیں ملا۔ نیتن یاہو اس معاملے تک نہیں پہنچے ہیں۔“

آل ثانی نے اپنے اس اندازے کا اعادہ کیا کہ جیسے جیسے دن گزرتے جائیں گے غزہ میں اسرائیلی حملوں میں شدت آئے گی جن میں بہت سی جانیں جائیں گی جن میں زیادہ تعداد شہریوں کی ہوگی۔ یرغمالیوں کو رہا کرنے پر حماس کی رضامندی ختم ہوسکتی ہے۔ بلنکن نے نیتن یاہو سے دوبارہ بات کرنے کی کوشش کا وعدہ کیا۔ ۱۴/اکتوبر کو، ان کا طیارہ دوحہ سے واشنگٹن کے لیے روانہ ہونے کے کچھ ہی دیر بعد، بلنکن نے آل ثانی کو ایک ٹیکسٹ پیغام بھیجا کہ نیتن یاہو آپ کی ثالثی کے لیے تیار ہیں۔ موساد کے ڈائریکٹر جلد پہنچیں گے۔“ آٹھ دن بعد برنیا دوحہ پہنچ گئے۔

اِس دوران، جیسا کہ توقع کی جاسکتی تھی، حماس نے اپنی قیمت بڑھادی۔ شن بیت کی سوچ یہ تھی کہ حماس کا مطالبہ اپنے تمام قیدیوں کی رہائی کا بھی ہوتا تو قبول کیا جانا چاہیے تھا کہ تمام اسرائیلی یرغمالی رہا کرالیے جاتے۔ حماس سے جنگ کا موقع اِس کے بعد تلاش کرنا چاہیے تھا۔

حماس کی لچکدار مذاکرات کی خواہش کے اشارے کرنل (ریٹائرڈ) ڈورون ہادار تک بھی پہنچے جنھوں نے کئی سال تک اسرائیلی فوج کے مذاکراتی یونٹ کی قیادت کی تھی۔

وہ کہتے ہیں ”مجھے پیغامات ملنے لگے۔ میں نے انٹیلی جنس کی معلومات کو جمع کرنا شروع کیا تو تصویر واضح ہونے لگی۔ فریقِ ثانی بھی سکتے میں تھا۔ حماس سیکڑوں یرغمالیوں، بوڑھوں، خوفزدہ عورتوں اور روتے ہوئے بچوں کی تصاویر سے پیدا ہونے والے بین الاقوامی عوامی تعلقات کے نقصان سے گھبرائی ہوئی تھی۔ ایسے میں ہم ایک ایسے معاہدے کا فریم ورک بناسکتے تھے جس کے ذریعے ہمارے پاس حماس پر حملوں کا بالکل درست جواز ہوتا۔“

اکتوبر کے وسط میں ہادار نے نیتن یاہو کے خارجہ پالیسی کے مشیر اوفر فالک کے دفتر میں منعقدہ ایک میٹنگ میں شرکت کی جو جنگی اہداف کی ابھرتی ہوئی ترتیب سے متعلق تھی۔ ہادار نے فورم کے سامنے اپنا نقطہ نظر پیش کرنے کی درخواست کی۔ ”میں نے فالک سے پوچھا مجھے بتائیں کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہاں کیا ہو رہا ہے؟ ہم عورتوں، بچوں کو اب واپس لاسکتے ہیں۔ یہ ایک کے بدلے ایک کا تبادلہ ہے۔ ہم اقدام شروع کرسکتے ہیں۔“

فالک نے گفتگو روک دی اور دوسرے شرکا سے کمرے سے باہر جانے کو کہا۔ ہادار نے بات جاری رکھی ”میں نے ان سے کہا آئیں ایک معاہدے کو آگے بڑھائیں۔ ہم انہیں ایک ہزار قیدیوں کی پیشکش کریں گے۔ اگر ضرورت پڑی تو دو ہزار کی بھی۔ دنیا اب ہمارے ساتھ ہے۔ آئیں بین الاقوامی دباؤ ڈالیں اور معاہدے کو آگے بڑھائیں۔“

فالک نے ہادار کو روک دیا۔ ”کوئی معاہدہ نہیں ہوگا۔ یہ داعش (ISIS) ہے۔ یہ قاتل ہیں۔ اِنہیں کچھ نہیں ملے گا۔ اپنی سوچ بدلیں، ڈورون۔“

بنیادی مسئلہ یہ تھا کہ حماس تنازع کے مستقل خاتمے کی تلاش میں تھی۔ سی آئی اے کے سابق ڈائریکٹر ولیم جے برنز اپنے مخصوص سنجیدہ انداز سے اس الجھن کو سمیٹتے ہیں ”نیتن یاہو صرف پہلے مرحلے کے معاہدے پر غور کرنے کے لیے تیار تھے لیکن انہوں نے دعویٰ کیا کہ انہیں بعد میں حماس کو تباہ کرنا جاری رکھنے کے اختیار کو مسلسل محفوظ رکھنا ہوگا۔ اور وہی ہمارے لیے ہمیشہ ایک چیلنج تھا۔۔۔ ہم اس الجھن کو کیسے سلجھائیں اور ہر ایک کو واپس لانے میں کیسے کامیاب ہوں؟“

نتیجہ یہ ہوا کہ جب اپنے شہریوں اور دشمن کی قید میں موجود فوجیوں سے نپٹنے کی بات آئی تو ریاستِ اسرائیل نے واقعی اپنی سوچ بدل لی۔ اور اس طرح جنگ کے مزید دو سال گزر جائیں گے اس سے پہلے کہ ایک ایسا معاہدہ طے پائے جو تمام یرغمالیوں کو، زندہ یا مردہ، غزہ سے واپس لائے گا جبکہ حماس ابھی تک قائم و دائم ہے۔

اسرائیلی وزیراعظم کے دفتر نے اس تحقیقاتی رپورٹ کو ''مکمل جھوٹ'' قرار دیا۔ باضابطہ جواب میں کہا گیا کہ وزیراعظم نیتن یاہو نے اس زیرِ بحث مدت کے دوران یو اے ای کے صدر سے کوئی بات نہیں کی اور نہ ہی ان سے کوئی وارننگ موصول ہوئی۔

شن بیت کے سابق چیف رونین بار اور اسرائیلی فوج کے سابق چیف آف اسٹاف ہرزی حالیوی نے کہا کہ انہیں یو اے ای کے صدر کی طرف سے دی گئی وارننگ کے بارے میں آگاہ نہیں کیا گیا تھا۔

اسرائیلی اخبار 'ہاریز' نے اس رپورٹ کے حوالے سے جب تبصرے کے لیے یو اے ای کے صدر شیخ محمد بن زاید سے رابطہ کیا تو اُن کی طرف سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔

(مترجم: ابوصباحت)

"Netanyahu received anexplicit warning days before Oct. 7". ("haaretz.com". Sep 8, 2026)

* * *

بقیہ: بچوں کی عادت سازی۔۔۔

اچھے کاموں میں صحت مند مسابقت کروائیں تاکہ بچے نیکی اور نظم و ضبط میں ایک دوسرے سے بہتر بننے کے جذبے سے سرشار ہو جائیں۔ ہر عمل سے پہلے نیت کرنے کی عادت ڈالیں تاکہ وہ جان سکیں کہ وہ کوئی بھی کام کیوں کر رہے ہیں، اس طرح وہ سمجھ پائیں گے کہ اچھی عادتیں دراصل اعلیٰ مقاصد سے جڑی ہوتی ہیں، جو ان کی کامیابی کے ضامن ہوتے ہیں۔

بچوں کو مختصر اور طویل مدتی مقاصد دیا کریں، تاکہ وہ کسی بھی اچھی عادت کو اپنانے کے لیے واضح، پُرعزم اور تیار رہیں۔ انہیں ضمیر کی آواز سے روشناس کرائیں، یہ وہ اندرونی رہنما ہے جو انہیں اچھائی اور برائی میں تمیز سکھاتا ہے۔

جب وہ اپنی اس ''اندرونی آواز'' کو سننا سیکھ لیتے ہیں تو ان کے اندر کا ہیرو بیدار ہوتا ہے، جو انہیں نیکی کرنے، خود کو بہتر بنانے اور نئی مثبت عادتیں اپنانے کی تحریک دیتا ہے۔

(بحوالہ: ماہنامہ ''زندگی نو'' نئی دہلی۔ دسمبر ۲۰۲۵ء)

* * *

اہلِ غزہ: اِبتلا و آزمائش اور ہماری چشم پوشی

رپورٹ: ڈاکٹر اسامہ الاشقر

کسی مظلوم قوم کی مدد صرف اُس وقت نہیں ہوتی جب ہم اُس کے لیے ہمدردی کے چند الفاظ ادا کریں، جذباتی بیانات دیں یا اُس کے حق میں چند رسمی سرگرمیاں انجام دیں۔ اصل مدد یہ ہے کہ جب اہلِ حق آزمائش کے انتہائی کڑے مرحلے میں ہوں، جب بھوک اُن کے گھروں تک پہنچ چکی ہو، جب خون بہہ رہا ہو اور اُنہیں فوری سہارے کی ضرورت ہو، تو ہم اپنی استطاعت کے مطابق اُن کے ساتھ کھڑے ہوں۔

خذلانِ عظیم یہ ہے کہ انسان جانتے بوجھتے مجاہدینِ اہلِ ثغر کو اُس وقت تنہا چھوڑ دے جب انہیں فوری نصرت اور عملی مدد کی سب سے زیادہ ضرورت ہو۔

۱۔ جب آپ اُن کی مدد کے لیے آگے نہیں بڑھتے:

آپ اُن کا ساتھ اُس وقت چھوڑ دیتے ہیں جب آپ جانتے ہیں کہ وہ شدید بھوک، محاصرے اور خونریزی کا سامنا کر رہے ہیں، مگر اس کے باوجود ان کی فوری مدد کے لیے اپنی استطاعت کے مطابق کچھ نہیں کرتے۔ آپ جانتے ہیں کہ تاخیر کے نتیجے میں مصیبت مزید سنگین ہو سکتی ہے، لیکن پھر بھی آپ انتظار کرتے رہتے ہیں۔

۲۔ جب آپ اُن کی آواز کے بجائے اُن پر سوال اٹھاتے ہیں:

آپ اُن کا ساتھ اُس وقت بھی چھوڑ دیتے ہیں جب آپ عوام کے سامنے ان کی بات کو تسلیم کرنے کے بجائے ان کی روایت اور مؤقف کو مشکوک بناتے ہیں، ان کی جدوجہد اور استقامت پر سوال اٹھاتے ہیں، ان کے فیصلوں اور اجتہادات کو طعن و تشنیع کا نشانہ بناتے ہیں اور مصیبت کے وقت انہیں ہی ان کے حالات کا ذمہ دار قرار دینے لگتے ہیں۔

اختلافِ رائے اپنی جگہ، لیکن بحران اور ابتلا کے عروج پر ایسے سوالات اٹھانا جو حوصلہ توڑ دیں اور مدد کے بجائے ملامت کو جنم دیں، اہلِ مصیبت کے لیے مزید بوجھ بن جاتا ہے۔ اختلاف کا جائز وقت مصیبت کے ٹل جانے کے بعد بھی آ سکتا ہے۔

۳۔ جب وعدے بہت اور عمل کچھ نہیں ہوتا:

آپ اُن کا ساتھ اُس وقت بھی چھوڑ دیتے ہیں جب آپ نے اُن کی نصرت اور حمایت کا عہد کیا ہو، لیکن عملی میدان میں آپ کی طرف سے نہ مؤثر اقدام دکھائی دے، نہ قابلِ ذکر مدد؛ صرف تقریریں، تجزیے، دعوے اور نمائشی سرگرمیاں باقی رہ جائیں۔

۴۔ جب مکمل تیاری کے انتظار میں مدد ہی مؤخر کر دی جائے:

آپ اُن کا ساتھ اُس وقت چھوڑ دیتے ہیں جب اپنی کمزوری، تاخیر اور محدود صلاحیت کو جاننے کے باوجود فوری طور پر دستیاب وسائل کو حرکت میں نہیں لاتے۔

میدان ہمیشہ اس بات کا انتظار نہیں کرتا کہ آپ کی تمام تیاریاں مکمل ہوں، تمام منصوبے بہترین شکل اختیار کر لیں اور آپ اپنی پوری قوت جمع کر لیں۔ اگر پوری قوت ممکن نہیں تو جتنی استطاعت ہے، اتنی ہی سے آغاز کیجیے: نصف قوت سے، ایک چوتھائی سے، حتیٰ کہ دسویں حصے سے۔ عملی قدم، کامل منصوبے سے زیادہ قیمتی ہو سکتا ہے۔

۵۔ جب ضرورت کہیں اور ہو اور آپ کی توانائی کہیں اور صَرف ہو:

اگر آپ جانتے ہیں کہ اِس وقت اہلِ مصیبت کو کس چیز کی فوری ضرورت ہے، مگر اپنی توانائی ایسے میدان میں صرف کرتے ہیں جس کی انہیں فی الحال ضرورت نہیں، تو یہ بھی ایک طرح کا خذلان ہے۔

ضرورت کا صحیح تعین اور وسائل کا درست رخ ہی حقیقی نصرت ہے۔

٦۔ جب فوری بحران کے دوران صرف مستقبل کے منصوبوں میں الجھ جائیں:

طویل المدت منصوبے اپنی جگہ اہم ہیں، لیکن جب لوگ روزانہ مر رہے ہوں، گھر تباہ ہو رہے ہوں اور زندگی کا بنیادی ڈھانچا برباد ہو رہا ہو تو ایسی سرگرمیوں کو ترجیح دینا جن کے نتائج کئی سال بعد ظاہر ہوں، موجودہ ذمہ داری سے فرار بن سکتا ہے۔

جو آگ آج لگی ہے، اسے آج ہی بجھانے کی کوشش ضروری ہے۔

۷۔ جب حقیقی اثر کے بغیر نمائشی سرگرمیوں میں مصروف ہوجائیں:

آپ اُن کا ساتھ اُس وقت بھی چھوڑ دیتے ہیں جب آپ ایسی تقریبات، سرگرمیوں اور اقدامات میں مشغول ہوجائیں جن کے بارے میں آپ پہلے ہی جانتے ہیں کہ وہ محض رسمی کارروائیاں ہیں، زمینی حقیقت پر ان کا کوئی خاص اثر نہیں اور نہ ہی وہ ظلم کی شدت کو کم کرنے میں کوئی حقیقی کردار ادا کرتی ہیں۔

مظلوموں کو صرف تصویروں اور نعروں سے زیادہ کی ضرورت ہوتی ہے؛ انہیں ایسا عمل چاہیے جو حقیقت کو بدلنے میں حصہ ڈالے۔

۸۔ جب آپ اپنی پالیسیوں کی حدیں بدلنے سے انکار کردیں:

اگر آپ نے خود کو ایسی مصلحت پسندانہ پالیسیوں کا پابند کر رکھا ہے جو آپ کے عمل کو محدود کرتی ہیں، تو بحران کے وقت ان حدود پر نظرِ ثانی ضروری ہے۔

ظلم کے مقابلے میں مؤقف کی بلندی، اگرچہ اس کی کچھ قیمت ادا کرنا پڑے، کبھی کبھی اجتماعی دباؤ پیدا کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ جب مختلف قوتیں اپنی اخلاقی اور سیاسی حدود بلند کرتی ہیں تو ان حکومتوں پر بھی دباؤ بڑھتا ہے جو بظاہر ہمدردی کا اظہار کرتی ہیں لیکن عملی طور پر ظلم کے خلاف مؤثر قدم نہیں اٹھاتیں۔

۹۔ جب معمول کی مصلحتیں ظلم کے ساتھ تعلقات پر غالب آجائیں:

اگر آپ کسی ایسے تعلق، مصلحت یا مفاہمت کا حصہ ہیں جس سے ظالم کو فائدہ پہنچتا ہے، تو کم از کم اتنا ضرور کیجیے کہ اپنی استطاعت کے مطابق اس صورتحال کو تبدیل کرنے کی کوشش کریں۔

اپنے معاشرے کو ظلم کے براہِ راست یا بالواسطہ اثرات سے پاک رکھنے کی کوشش بھی نصرت کی ایک صورت ہے۔

۱۰۔ جب مظلوم کی تکلیف کو ذاتی یا سیاسی مفاد کا ذریعہ بنالیں:

آپ اُن کا ساتھ اُس وقت بھی چھوڑ دیتے ہیں جب ان کی تکلیف کو سیاسی مقبولیت، جماعتی مفاد، ذاتی شہرت یا مالی منفعت کے لیے استعمال کرتے ہیں، مگر آپ کے اقدامات کا کوئی حقیقی تعلق اس مقام سے نہیں ہوتا جہاں درد موجود ہے۔

مظلوم کی آہ کو اپنی تشہیر کا ذریعہ بنانا اور اس کے درد کو عملی ذمہ داری سے جدا کر دینا اخلاقی دیانت کے خلاف ہے۔

۱۱۔ جب اپنی ناکامی تسلیم کرنے کے بجائے خاموش رہیں:

اگر آپ مدد کرنے میں ناکام رہے ہیں تو کم از کم اپنی ناکامی کو تسلیم کیجیے، اپنی ذمہ داری واضح کیجیے اور دوسروں کو وہ راستہ اختیار کرنے کی دعوت دیجیے جس پر آپ خود آگے نہیں بڑھ سکے۔

اگر آپ کسی ذمہ داری کے امین ہیں اور اسے ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے تو اسے ایسے شخص کے سپرد کرنا زیادہ دیانت دارانہ ہے جو اسے ادا کر سکے۔

۱۲۔ جب اپنے ساتھ موجود لوگوں کو بھی متحرک نہ کریں:

آپ کی ذمہ داری صرف خود کچھ کرنے تک محدود نہیں۔ اگر آپ کے پاس لوگوں کو متحرک کرنے، انہیں کسی مؤثر اور جائز طریقے سے مدد کے لیے آمادہ کرنے اور ظلم کے خلاف اجتماعی آواز پیدا کرنے کی صلاحیت ہے، تو اسے استعمال نہ کرنا بھی ایک کوتاہی ہے۔

۱۳۔ جب مؤثر اور جائز اقدام کا راستہ موجود ہو، مگر آپ خاموش رہیں:

اگر آپ کے پاس ایسا جائز اور مؤثر راستہ موجود ہے جس کے ذریعے آپ ظالم پر دباؤ ڈال سکتے ہیں، مظلوم کی مدد کر سکتے ہیں یا ظلم کے نظام کے خلاف مؤثر آواز بن سکتے ہیں، مگر آپ محض سہل پسندی یا خوف کی وجہ سے کچھ نہیں کرتے، تو آپ اپنی استطاعت کے ایک اہم حصے کو ضائع کر رہے ہیں۔

۱۴۔ ہر گزرتا ہوا لمحہ ذمہ داری کو بڑھاتا ہے:

بحران کے میدان میں وقت غیر جانبدار نہیں ہوتا۔ ہر گزرتا ہوا گھنٹہ کسی کے لیے مزید نقصان، مزید تباہی اور مزید انسانی قیمت کا سبب بن سکتا ہے۔

طویل انتظار کے بعد بھی اگر ہم صرف یہ کہتے رہیں کہ ’’ابھی وقت نہیں آیا‘‘، تو ہمیں اپنے ضمیر سے یہ سوال ضرور کرنا چاہیے کہ آخر وہ وقت کب آئے گا جب ہماری ذمہ داری ہمیں عمل پر مجبور کرے گی؟

۱۵۔ مسلسل بے عملی کا انجام:

اگر انسان اپنی پرانی عادات، سہل پسندی، مصلحتوں اور بے اثر سرگرمیوں میں گرفتار رہتا ہے اور ان بھائیوں کو تنہا چھوڑ دیتا ہے جو شدید آزمائش سے گزر رہے ہیں، تو اسے اس خطرے سے غافل نہیں ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین اور اپنے مظلوم بندوں کی مدد کے لیے کسی اور قوم کو کھڑا کر سکتا ہے۔

قرآن کا انتباہ واضح ہے:

’’اگر تم نہ نکلو گے تو اللہ تمہیں دردناک عذاب دے گا اور تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو لے آئے گا، اور تم اسے کچھ نقصان نہ پہنچا سکو گے، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔‘‘

یہ صرف دوسروں کے لیے سوال نہیں، ہمارے اپنے لیے بھی ایک آئینہ ہے۔

ہمیں خود سے پوچھنا چاہیے:

کیا ہم واقعی مظلوموں کے ساتھ کھڑے ہیں؟

کیا ہماری آواز، ہمارا وقت، ہماری صلاحیت، ہمارے وسائل اور ہماری ترجیحات ان کے درد سے جڑی ہوئی ہیں؟

یا ہم نے حمایت کو محض الفاظ، تقریبات، تصاویر اور بیانات تک محدود کر دیا ہے؟

مظلوموں کی نصرت صرف یہ نہیں کہ ہم ان کے لیے افسوس کا اظہار کریں؛ نصرت یہ ہے کہ ہم اپنی استطاعت کے دائرے میں حقیقی، مؤثر اور مسلسل کردار ادا کریں۔

اس لیے خبردار رہیے کہ تاریخ اور اپنے رب کے سامنے ہمارا نام ان لوگوں میں نہ لکھا جائے جنھوں نے آزمائش کے سب سے کڑے وقت میں اپنے بھائیوں کو تنہا چھوڑ دیا۔

یاد رکھیے: اللہ اہلِ حق کا ولی ہے، اور وہ اپنی مدد کے لیے انہی بندوں کو منتخب کرتا ہے جو اخلاص، ہمت اور عمل کے ساتھ اس کے دین اور مظلوموں کا ساتھ دیتے ہیں۔

(بحوالہ: ماہنامہ ’’براہِ راست‘‘ لاہور۔ ستمبر ۲۰۲۶ء)

* * *

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی کی شائع کردہ کتاب
جدیدیت کے گمراہ کن افکار
اور
اسلام
دانیال حقیقت جُو
قیمت: ۸۰۰ روپے
اکیڈمی بک سینٹر۔ D-35، بلاک۔5
فیڈرل ’بی‘ ایریا، کراچی۔ فون: 021-36368020

مکّہ مُعاہدہ اور بنگلا دیش

Purna Lal Chakma

حال ہی میں مکہ مکرمہ میں پاکستان، سعودی عرب اور ترکی کے درمیان دفاعی معاہدہ یا اسٹریٹجک معاہدہ طے پایا ہے۔ اس معاہدے نے بہت سوں کی نیندیں اُڑا دی ہیں۔ بھارت بھی پریشان ہے اور اسرائیل بھی۔ سب سے بڑھ کر امریکا پریشان ہے کیونکہ سعودی عرب جیسے ملک نے اُس پر عدم اعتماد کرتے ہوئے اب اپنی سلامتی کی خاطر پاکستان اور ترکی کی طرف دیکھنے کو ترجیح دی ہے۔ یورپی یونین تو اِس پوری مساوات میں کہیں بھی ہے ہی نہیں۔ اب بنگلا دیش بھی مکہ معاہدہ کا حصہ بننے میں دلچسپی لیتا دکھائی دے رہا ہے۔ یہ بڑی اور اہم تبدیلی ہے۔ بھارت اور بنگلا دیش کے تعلقات میں خاصی کشیدگی پائی جاتی ہے۔ ایسے میں اگر بنگلا دیش مکہ معاہدہ کا حصہ بن گیا تو بھارتی قیادت اور فوج، دونوں کے لیے یہ تبدیلی انتہائی پریشن کُن ہو گی۔ زیرِنظر مضمون اِسی تناظر میں ہے۔

مکہ معاہدہ سے بنگلا دیش کا جُڑنا اب محض قیاس آرائی نہیں کیونکہ بین الاقوامی اور اسٹریٹجک امور کے ماہرین بھی اپنی رائے پیش کررہے ہیں۔ بنگلا دیش مکہ معاہدہ کا حصہ بننے کی منزل سے دور ہے مگر ڈھاکا میں سینئر حکام کھل کر کہہ رہے ہیں کہ اگر مکہ معاہدہ بنگلا دیش کے مفادات کا نگران ثابت ہونے کی اہلیت رکھتا ہو تو اِس کے لیے بنگلا دیش کے دروازے کُھلے ہیں۔

مکہ معاہدہ کا وقت بہت حساس ہے۔ بھارت اور بنگلا دیش کے تعلقات شدید کھنچاؤ کا شکار ہیں۔ دوسری طرف اسلام آباد نے ڈھاکا سے دفاعی تعلقات قائم کرنے کو ترجیح دینا شروع کردیا ہے۔ ایسے میں بھارت اور بنگلا دیش کے درمیان دراندازی کے مسئلے پر کشیدگی بڑھ گئی ہے اور دونوں کی سرحدیں بھی انتہائی حساس ہوچکی ہیں۔ یہ تمام مسائل مکہ معاہدہ نے پیدا نہیں کیے مگر ہاں، یہ معاہدہ پاکستان اور بنگلا دیش کو قریب ضرور لائے گا اور اس کے نتیجے میں خلیجِ بنگال کے خطے کی تزویراتی تصویر سنگین شکل اختیار کرے گی۔

اسرائیلیوں کے لیے بھی یہ معاملہ بہت اہم ہے۔ مکہ معاہدہ میں ترکی کی شمولیت نے اسرائیلیوں کی تشویش میں اضافہ کیا ہے۔ دوسری طرف پاکستان نے اس معاہدے کا فریق بن کر بھارت کے لیے پریشانی کا سامان کیا ہے۔

مکہ معاہدہ پر مکۂ مکرمہ میں ۷/اگست کو دستخط ہوئے۔ معاہدے کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ تینوں ملک ایک دوسرے کو مل کر تحفظ فراہم کریں گے یعنی ایک فریق پر حملہ تمام فریقوں پر حملہ تصور کیا جائے گا۔ ویسے معاہدے کی تفصیلات اب تک پوری طرح واضح نہیں، بہت کچھ ابہام کے پردے میں ہے۔

بنگلا دیش مکہ معاہدہ کا پورا یا جُزئی رکن نہیں ہے مگر اُس نے یہ واضح کردیا ہے کہ اگر اُسے اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر مکہ معاہدہ کا حصہ بننے میں کوئی قباحت محسوس نہ ہوئی تو وہ ایسا کر گزرے گا۔ بنگلا دیش کے اس موقف نے بھارتی قیادت کی نیند اڑا دی ہے۔ بنگلا دیش کو اپنی سرحدوں کے ساتھ ساتھ معیشت کے دفاع کی بھی فکر لاحق ہے۔ اگر وہ مکہ معاہدہ کا حصہ بنتا ہے تو معاشی طور پر بھی سعودی عرب اور ترکی سے اُسے غیر معمولی فوائد حاصل ہوسکتے ہیں۔

بنگلا دیش کی ایک وزیرِ مملکت شمع عبید نے کہا ہے کہ کوئی بھی فیصلہ اِس نکتے پر منحصر ہوگا کہ مکہ معاہدہ کا حصہ بننے سے بنگلا دیشیوں کا تحفظ ممکن ہوسکے گا یا نہیں۔ اِن بیانات سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہیے کہ بنگلا دیش نے مکہ معاہدہ کا حصہ بننے کا فیصلہ کرلیا ہے اور اُس فیصلے کا اعلان بس ہونے ہی والا ہے۔ یہ تمام بیانات اِتنا ضرور ثابت کرتے ہیں کہ بنگلا دیش کے لیے اب مکہ معاہدہ خارجہ پالیسی کا ایک اہم موضوع ہے۔ اِس معاملے کو اب محض قیاس آرائی نہ سمجھا جائے یا یہ تصور نہ کیا جائے کہ بنگلا دیش کی حکومت خالی فضا میں تیر چلا رہی ہے۔

بنگلا دیش اپنے لیے واضح فوائد دیکھ سکتا ہے۔ سعودی عرب ایک اہم معاشی اور سیاسی پارٹنر ہے۔ ترکی میں دفاعی صنعت تیزی سے پروان چڑھ رہی ہے۔ پاکستان اسلحے کے ساتھ ساتھ تربیت اور عسکری سطح پر بھرپور تعاون بھی فراہم کرسکتا ہے۔ اور یہ نکتہ تو بھولا ہی نہیں جاسکتا کہ مکہ معاہدہ کا حصہ بن کر پاکستان نے بھارت کے لیے گھبراہٹ اور بدحواسی کا سامان کیا ہے۔ ایسے میں اگر بنگلا دیش بھی اس معاہدے کا رکن بنتا ہے تو بھارت کی الجھن دوچند ہوجائے گی۔

پاکستان کیوں اہم ہے؟

پاکستان اور بھارت کے درمیان اب تک تین جنگیں ہوچکی ہیں۔ ۱۹۹۹ء میں کارگل کا معرکہ ہوا۔ اور پھر ۲۰۲۵ء میں فضائی معرکہ آرائی ہوئی جس میں پاکستان نے بھارتی سُورماؤں کو دُھول چٹائی۔ دونوں ملکوں کے پاس جوہری ہتھیار ہیں۔ پاکستان اب بھی بھارتی فوج کے لیے منصوبہ بندی کے حوالے سے سب سے بڑا دردِ سر ہے۔

بنگلا دیش کا تاریخ میں اہم مقام ہے۔ ۱۹۷۱ء تک پاکستان کو بھارت کے دونوں اطراف ہونے کی انفرادیت حاصل تھی۔ بھارتی فوج کو مغربی پاکستان کے ساتھ ساتھ مشرقی پاکستان پر بھی متوجہ رہنا پڑتا تھا۔

ایک زمانے میں پاکستان کی مجموعی عسکری سوچ یہ تھی کہ مغربی پاکستان کے موثر دفاع کی صورت ہی میں مشرقی پاکستان کا موثر دفاع ممکن ہے۔ پاکستان کے لیے تب جغرافیہ ایک بڑی کمزوری کی شکل میں پریشانی کا سب سے بڑا سبب تھا۔ مغربی اور مشرقی پاکستان کہنے کو ایک ملک کے دو حصے تھے مگر عملاً وہ دو الگ ملک تھے۔ بیچ میں بھارتی سمندر تھا۔ خلیجِ بنگال میں بین الاقوامی حدود بھی تھیں مگر بھارت کو یہ برتری حاصل تھی کہ مشرقی پاکستان اُس کے لیے ایک محصور علاقے کی حیثیت رکھتا تھا کیونکہ وہ بہت اندر واقع تھا یعنی بھارتی علاقوں سے گھرا ہوا تھا۔ جنگ کے زمانے میں مشرقی پاکستان کو کمک پہنچانا مغربی پاکستان کے لیے انتہائی دُشوار ہوا کرتا تھا۔

۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ نے بھارت کے اسٹریٹجک نقشے کو بدل دیا۔ مشرقی پاکستان نے ملک سے الگ ہوکر بنگلا دیش کی شکل اختیار کرلی۔ پاکستان اپنے مشرقی بازو سے محروم ہوکر کمزور پڑ گیا۔ اب بھارت کو اپنے دونوں طرف پاکستان کا سامنا نہیں تھا۔ اب اُسے صرف بچے کھچے یعنی سابق مغربی پاکستان پر متوجہ رہنا تھا۔

جو کچھ اِس وقت ہو رہا ہے اُس سے یہ نتیجہ اخذ نہ کیا جائے کہ ایک بار پھر مشرقی پاکستان کو نئی زندگی دینے کی کوشش کررہا ہے۔ اِس امر کا اب تک کوئی ثبوت نہیں ملا ہے۔ ہاں، تاریخ ضرور یہ وضاحت کرتی ہے کہ بنگلا دیش میں پاکستان کی عسکری اور انٹیلی جنس کی سطح پر بڑھتی ہوئی دلچسپی بھارتی قیادت اور اُس کے منصوبہ سازوں کے لیے کیا معنی رکھتی ہے۔

پاکستان کو بھارت کے خلاف زیادہ مضبوط ہونے کے لیے بنگلا دیش میں فوجی اڈے تعمیر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسلحے کی فروخت سے دونوں ملکوں کے درمیان تربیت اور اسلحے کی مرمت یا ترقی و بہتری کے نام پر طویل المیعاد اور مضبوط تعلقات قائم ہوسکتے ہیں، عسکری سطح پر مختلف معاملات میں اشتراکِ عمل کرسکتے ہیں۔ انٹیلی جنس کی سطح پر تعاون بھی

ایسے ادارے قائم کرسکتا ہے جو برسوں قائم ودائم رہیں۔

دونوں ملکوں کے درمیان عسکری سطح پر تعاون بڑھ رہا ہے۔ جنوری ۲۰۲۶ء میں پاکستان اور بنگلا دیش کے درمیان جے ایف۔۱۷ لڑاکا طیاروں کی فروخت اور وسیع تر دفاعی تعاون کے حوالے سے بات چیت ہوئی۔ دونوں ملکوں کی فوج میں اعلیٰ سطح کے رابطے بھی بڑھے ہیں۔

پاکستان کے لیے بنگلا دیش اسلحے کا ایک اچھا گاہک ثابت ہوسکتا ہے۔ دفاعی ساز وسامان کی فروخت، تربیت اور فوجی سطح کے باقاعدہ رابطے بھارت کے مشرقی پہلو میں سلامتی کے حوالے سے جامع اثرات کا ایک اچھا نیٹ ورک قائم کرسکتے ہیں۔

جغرافیہ اب بھی پاکستان کو محدود رکھتا ہے۔ بھارت اب بھی پاکستان اور بنگلا دیش کے درمیان واقع ہے۔ ۱۹۷۱ء میں یہ بات کُھل کر سامنے آگئی تھی کہ اسلام آباد مشکل گھڑی میں بہت بڑے پیمانے پر اپنی فوج کو متحرک کرکے مشرقی پاکستان نہیں بھیج سکتا تھا۔ فوجی کمک کو بھارتی علاقے سے گزرنا ہوتا تھا۔ اگر بنگلا دیش اور پاکستان کے درمیان اسلحے کی فروخت، تربیت، جنگی ساز وسامان کی مرمت اور دیکھ بھال، انٹیلی جنس نیٹ ورکنگ، فوجی مشاورت، ڈرونز، راڈار اور طویل المیعاد اسٹریٹجک اثر ورسوخ کے حوالے سے روابط بڑھے تو بھارتی قیادت اور فوج، دونوں کے لیے یہ صورتِ حال بہت پریشان کن ثابت ہوگی۔

بھارت اور بنگلا دیش میں بدگمانیاں

ایسا نہیں ہے کہ بھارت اور بنگلا دیش کے درمیان معاملات پُرسکون ہیں اور ایسے میں مکہ معاہدہ وارد ہورہا ہے۔ بنگلا دیش چاہتا ہے کہ بھارت اُس کی سابق وزیرِ اعظم شیخ حسینہ واجد کو اُس کے حوالے کردے۔ بنگلا دیش کے وزیرِ اعظم طارق رحمٰن کو نئی دہلی کا دورہ کرنا ہے مگر شیخ حسینہ واجد کے معاملے میں پائی جانے والی کھینچا تانی اور بدگمانی کے باعث کچھ واضح نہیں کہ یہ دورہ کب ہوسکے گا۔

بھارت کے وزیرِ خارجہ ایس جے شنکر نے ۲۲؍اگست کو کہا کہ بھارت اور بنگلا دیش کے تعلقات کو باہمی اعتماد کی آزمائش پر پورا اترنا چاہیے۔ دوسری طرف بنگلا دیش کی حکومت اب اپنی خارجہ پالیسی ’’سب سے پہلے بنگلا دیش‘‘ کے اُصول کو بنیاد بنا کر ترتیب دے رہا ہے۔

دونوں میں سے کسی ملک کی پوزیشن غیر معمولی نہیں۔ ہر ملک کو اپنے قومی مفادات کا تحفظ یقینی بنانے کا حق حاصل ہے۔ مسئلہ اُس وقت اُٹھ کھڑا ہوتا ہے جب بنگلا دیش کا قومی مفاد کا تصور بھارت کی سلامتی کے لیے خطے کی شکل میں ابھرتا ہے۔ دوسری طرف بھارت اپنی سلامتی کے لیے جو کچھ کرنا چاہتا ہے، اُس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ وہ بنگلا دیش کے تمام آپشنز کو کنٹرول کرنا چاہتا ہے۔

بنگلا دیش اور بھارت کی سرحد بھی کشیدگی کا ایک اہم اور مستقل ذریعہ ہے۔ بھارت نے مبینہ بنگلا دیشی درانداز وں یعنی غیر قانونی تارکین وطن کو شناخت کرکے نکالنے کی کوششیں تیز کردی ہیں۔ بنگلا دیش نے الزام لگایا ہے کہ بھارت لوگوں کو متعلقہ نارمل قانونی طریقِ کار اپنائے بغیر بنگلا دیشی علاقوں میں دھکیلنے پر تُلا ہوا ہے۔

بہرکیف، بھارت اور بنگلا دیش کے درمیان مختلف شعبوں میں اشتراکِ عمل بھی پایا جاتا ہے۔ دونوں ملکوں کی بارڈر سکیورٹی فورس نے ایک دوسرے کو اعتماد میں لے کر گشت کرنے اور انٹیلی جنس شیئرنگ کو زیادہ موثر بنانے پر بھی رضامندی ظاہر کی ہے جس سے یہ اشارا ملتا ہے کہ سیاسی سطح پر اعتماد کی شدید کمی کے باوجود سلامتی کے حوالے سے دونوں ملکوں کی افواج کے درمیان تعاون اور اشتراکِ عمل جاری ہے۔

رائے عامہ کے چند حالیہ جائزوں سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ بھارت کے بارے میں بنگلا دیشیوں کی رائے بہت حد تک بدل چکی ہے یعنی ناموافق ہوچکی ہے۔ پیو ریسرچ سینٹر کے ایک حالیہ سروے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کم وبیش ۵۱ فیصد بنگلا دیشی بھارت کے بارے میں اچھی رائے کے حامل نہیں۔ وہ بھارت پر بھروسا کرنے کو تیار نہیں کیونکہ اُن کے خیال میں ایسا کرنے سے ملک کو نقصان ہی پہنچا ہے۔ ۲۰۲۴ء میں سیاسی اکھاڑ پچھاڑ کے بعد ہونے والے ایک کلیدی سروے سے معلوم ہوا کہ بنگلا دیش کے نوجوانوں کی واضح اکثریت اب پاکستان کی طرف دیکھ رہی ہے۔

یہ سب کچھ اپنی جگہ مگر یہ نہ سمجھا جائے کہ پورا کا پورا بنگلا دیش ہی بھارت مخالف ہے۔ نوجوان بنگلا دیشی بھارت کو حالیہ واقعات (سرحدی تنازعات، اندرونی سیاست اور شیخ حسینہ واجد سے دیرینہ تعلقات) کی بنیاد پر پرکھتی ہے۔ معاملات کو ۱۹۷۱ء کی جنگ کے تناظر میں دیکھنے اور پرکھنے کا زمانہ گیا۔ اِس کے نتیجے میں پاکستان کو بنگلا دیش سے تعلقات بہتر بنانے کے حوالے سے مزید سیاسی گنجائش مل رہی ہے۔

بھارت کے لیے پریشانی کا باعث ایک اور معاملہ بھی ہے۔ اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل نے حال ہی میں ایک جائزہ رپورٹ میں بتایا ہے کہ القاعدہ (برصغیر) یعنی AQIS ممکنہ طور پر بنگلا دیش میں اپنے خفیہ ٹھکانے قائم کرنے کی کوشش کررہی ہے۔ بنگلا دیشی پولیس اور خفیہ اداروں کا کہنا ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں کیونکہ اُنہیں اب تک اِس حوالے سے کوئی شواہد نہیں ملے۔

بنگلا دیش کو کسی بھی طور القاعدہ کے اڈے یا گڑھ کے طور پر بیان نہیں کیا جاسکتا۔ بھارت کو ایک طویل مدت سے جہادیوں کا سامنا رہا ہے۔ ایسے میں اگر محض گمان بھی ہو کہ القاعدہ (برصغیر) بنگلا دیش میں قدم جمانے کی کوشش کررہی ہے تو یہ اُس کے لیے شدید پریشانی کا باعث ہوگا۔

ہندوؤں، بدھسٹوں، مسیحیوں اور مقامی اقلیتی نسلی آبادیوں پر حملوں نے بھی بنگلا دیش کی اندرونی سلامتی کے حوالے سے سوال کھڑے کیے ہیں۔ ایسے واقعات کے لیے، کسی ثبوت یا جواز کے بغیر، اسلامی تنظیموں کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ بہرکیف، بنگلا دیش میں اقلیتوں کے تحفظات ہیں جو ایک اہم اندرونی اور علاقائی مسئلے کا درجہ رکھتے ہیں۔

اِس پوری صورتِ حال کا نتیجہ غیر معمولی اسٹریٹجک ماحول کے پیدا ہونے کی صورت میں برآمد ہوا ہے۔ بھارت اور بنگلا دیش اب بھی کئی معاملات میں باہمی تعاون کی راہ پر گامزن ہیں تاہم دونوں کے درمیان اس بات پر اعتماد کی دیوار گر رہی ہے کہ پاکستان نے بنگلا دیش سے عسکری تعلقات کی سطح بلند کرنا شروع کردیا ہے۔

چار ملک، دو منظر نامے

مکہ معاہدہ اِس لیے منفرد اور اہم ہے کہ مختلف حریفوں سے ایک ہی دفاعی ڈھانچے کے تحت نپٹنا آسان ہوجائے گا۔ اسرائیل سے ترکی کے تعلقات تیزی سے گراوٹ کا شکار ہوئے ہیں، بالخصوص شام اور وسیع تر علاقائی مسابقت کے معاملے میں۔

مکہ معاہدہ نے اسرائیل۔ ترک تعلقات میں کشیدگی پیدا نہیں کی، یہ تو پہلے ہی موجود تھی۔ سرکاری طور پر مکہ معاہدہ کو اسرائیل مخالف بھی تصور نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں، اس دفاعی معاہدے میں ترکی کے شامل ہونے سے اسرائیل کو یہ سوچنا پڑے گا کہ کشیدگی بڑھنے اور وسیع تر محاذ آرائی کا امکان پیدا ہونے پر حریف زیادہ طاقت کے سامنے آئے گا۔

جنوبی ایشیا کو بھی ایسی ہی مشکل صورتِ حال کا سامنا ہے۔ اسرائیل کے لیے ترکی مکہ معاہدہ کا ایک حساس رکن ہے۔ بھارت کے لیے پاکستان حساس ملک ہے۔ بھارت اور اسرائیل کے درمیان غیر معمولی سطح پر دفاعی تعاون پایا جاتا ہے۔ اِس سے علاقائی سطح پر سلامتی کی صورتِ حال کے

حوالے سے مشکلات میں اضافہ ہوتا ہے۔

پاکستان، بہرحال، بھارت کے لیے پریشانی کا سب سے بڑا اور براہِ راست سبب ہے۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا ہے کہ بھارت اور پاکستان، بھارت اور بنگلا دیش اور اسرائیل اور ترکی کے درمیان کشیدگی مکہ معاہدہ سے پیدا نہیں ہوئی مگر وسیع تر دفاعی تعاون کا یہ معاہدہ اِن تمام معاملات کو زیادہ پریشان کن ضرور بنا سکتا ہے۔

بنگلا دیش کیا بدل سکتا ہے؟

بنگلا دیش ایک خود مختار ریاست ہے۔ اگر بنگلا دیش کسی بھی ملک سے دفاعی معاہدہ کرتا ہے یا کسی بھی دفاعی معاہدے کا حصہ بنتا ہے تو بھارت کو اِس پر معترض ہونے یا اُسے مسترد کرنے کا حق حاصل نہیں۔ بنگلا دیش کسی بھی ملک سے اسلحہ اور جنگی ساز و سامان خرید سکتا ہے، عسکری تربیت بھی پاسکتا ہے۔ بنگلا دیش کسی بھی اعتراض کے جواب میں کہہ سکتا ہے کہ اسٹریٹجک خود مختاری کے لیے اُسے کئی شراکت داروں کی ضرورت ہے اور وہ پاکستان سے بھی قریبی تعلقات کا حامل ہوسکتا ہے۔ ترکی اور سعودی عرب کسی بھی اعتبار سے خود بہ خود بنگلا دیش کو بھارت مخالف نہیں بنا رہے۔

بھارت کو مکہ معاہدہ سے بہت زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اُسے یہ دیکھنا چاہیے کہ بنگلا دیش اِس دفاعی معاہدے کا حصہ بننے کی صورت میں پاکستان اور ترکی کے ساتھ فوجی مشقیں کرتا ہے یا نہیں، وسیع تر انٹیلی جنس شیئرنگ کی جاتی ہے یا نہیں، فوجی مشیروں کی میٹنگز ہوتی ہیں یا نہیں، Integrated Weapon System بنگلا دیش کو فراہم کیے جاتے ہیں یا نہیں اور یہ تمام ممالک طویل المیعاد دفاعی منصوبہ سازی کرتے ہیں یا نہیں۔

بھارت کو بھی اب خلیجِ بنگال کے خطے میں ڈرونز، راڈار، فضائی دفاع میں تعاون اور بحری امور میں بہتر رابطہ کاری پر متوجہ ہونا پڑے گا۔ بنگلا دیش خلیجِ بنگال اور بھارت کے شمال مشرقی حصے کے ساتھ واقع ہے۔ بنگلا دیش کے ساتھ سلیگری کاریڈور بھی واقع ہے جو بھارت کی شمال مشرقی ریاستوں کو مین لینڈ بھارت سے جوڑتا ہے۔ بنگلا دیش سے کشیدگی بڑھنے کی صورت میں یہ کاریڈور بند ہو جانے پر بھارت کی اِن ریاستوں کا باقی ملک سے رابطہ منقطع ہوسکتا ہے۔

بھارت کے لیے، اِس صورتِ حال میں، بنیادی سوال یہ ہے کہ بنگلا دیش سے پاکستان محض عمومی سفارتی تعلقات کو مضبوط بنا رہا ہے یا بھارت کی مشرقی سمت اپنی اسٹریٹجک پوزیشن مضبوط بنانے کی بھرپور کوشش کر رہا ہے۔ بنگلا دیش کو بھی سوچنا ہوگا کہ وہ مکہ معاہدہ کا حصہ بننے کی صورت میں سلامتی کی جو ضمانت حاصل کرے گا، کیا وہ اس قدر وقیع ہوگی کہ کسی ایسے ملک سے معاملات بگاڑے جائیں جو اُسے زمینی طور پر بہت نمایاں حد تک گھیرے ہوئے ہے۔

جارحانہ عزائم کے بغیر بھی سلامتی کے حوالے سے ایک شدید نوعیت کی بحرانی کیفیت پیدا ہوسکتی ہے۔ بنگلا دیش مکہ معاہدہ کی طرف بڑھ سکتا ہے کیونکہ اُسے اپنی سلامتی یقینی بنانے کے لیے ٹھوس ضمانت اور مدد درکار ہے۔ بھارت اپنی دفاعی صلاحیت بڑھانے کے لیے زیادہ بے تابی اور جوش و خروش کا مظاہرہ کرسکتا ہے کیونکہ بنگلا دیش کے مکہ معاہدہ کا حصہ بننے کی صورت میں اُسے واضح خطرہ محسوس ہوگا۔ ایسی حالت میں ڈھاکا پر مزید دباؤ مرتب ہوگا اور وہ فطری طور پر پاکستان سے مزید قریب ہونے کو ترجیح دے گا۔

بھارت کو بھی غیر معمولی نوعیت کے احساسِ ذمہ داری کا مظاہرہ کرنا ہے۔ اگر بھارتی قیادت بنگلا دیشی خارجہ پالیسی کے ہر آزادانہ فیصلے کو بھارت مخالف سمجھے گی تو اِس کے نتیجے میں ان سیاسی قوتوں کی بھرپور حوصلہ افزائی ہوگی جو بنگلا دیش کو پاکستان اور چین سے قریب ہونے کی تحریک دیتی ہیں۔

سیاسی بحران اسٹریٹجک ہوسکتا ہے؟

تین بڑے امکانات موجود ہیں۔ بنگلا دیش مکہ معاہدہ پر غور تو کرے مگر شاید اُس کا حصہ بننے کو ترجیح نہ دے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ مکہ معاہدہ کا حصہ تو بنے مگر تربیت، اسلحے کی خریداری اور سیاسی رابطہ کاری کو محدود رکھے اور کسی بھی بیرونی فوج کو اپنی سرزمین پر دیکھنے کو ترجیح نہ دے۔ ایسی کسی بھی صورتِ حال کو سنبھالنا کچھ زیادہ مشکل نہ ہوگا۔

زیادہ خطرناک اور پریشان کن منظر نامہ وہ ہوگا جس میں وسیع پیمانے پر عسکری تعاون یا اشتراکِ عمل دکھائی دے۔ اگر پاکستان نے بنگلا دیش کے ساتھ باقاعدہ فوجی مشقیں بڑھا دیں، فوجی مشیروں کی ملاقاتوں کا اہتمام کیا، Weapon System کو مربوط کرنا شروع کیا یا طویل المیعاد آپریشنل منصوبہ سازی شروع کی تو بھارت مکہ معاہدہ کو ایک بڑے سکیورٹی اسٹرکچر کے طور پر دیکھے گا جو اُس کی مشرقی سرحد تک پہنچ رہا ہوگا۔

بنگلا دیش کو بھی سوچنا پڑے گا کہ کیا مکہ معاہدہ اُسے کسی بھی بحرانی کیفیت میں بھارت کے خلاف کچھ دے سکے گا یا نہیں۔ بھارتی علاقوں کے ہاتھوں پاکستان تو بنگلا دیش سے الگ ہے ہی، سعودی عرب اور ترکی بھی بنگلا دیش کی سرزمین سے ہزاروں کلومیٹر دور ہیں۔ ہتھیار، انٹیلی جنس اور سیاسی حمایت طویل فاصلے طے کرسکتی ہے مگر افواج کے لیے ایسا کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ کا مرکزی سبق یہ ہے کہ جغرافیہ ہر جنگ کا نتیجہ تو طے نہیں کرتا مگر ہاں، دور افتادہ حلیف جو کچھ کرسکتے ہیں، اُس کی چند حدود ضرور متعین کرتا ہے۔

مکہ معاہدہ فطری اور لازمی طور پر بنگلا دیش کو محفوظ تر نہیں بنائے گا اور دونوں ملک یعنی بھارت اور بنگلا دیش لازمی طور پر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نہیں ہو جائیں گے۔ پہلے یہ دیکھنا پڑے گا کہ بنگلا دیش کے مکہ معاہدہ کا حصہ بننے کی صورت میں فوجی یا دفاعی تعاون کی نوعیت اور وسعت کیا ہوگی۔

اصل خطرہ یہ ہے کہ کہیں مختلف ٹرینڈز آپس میں مل نہ جائیں۔ بنگلا دیش اور بھارت کے درمیان سیاسی سطح پر اعتماد گھٹ رہا ہے، پاکستان نے بنگلا دیش سے دفاعی تعلقات کو دوبارہ مستحکم کرنا شروع کردیا ہے، سرحدی کشیدگی انتہائی حساس ہو چلی ہے، بنگلا دیش میں بھارت کے حوالے سے سوچ منفی ہو چلی ہے اور اِسی موقع پر سلامتی کے حوالے سے نئے خدشات بھی سَر اٹھا رہے ہیں۔ بنگلا دیش زیادہ سے زیادہ تزویراتی خود مختاری چاہتا ہے مگر نئی دہلی یہ سمجھ سکتا ہے کہ پاکستان بھارت کے مشرقی پہلو میں اپنا اثر و رسوخ بڑھا رہا ہے جہاں سے ۱۹۷۱ء میں غائب ہوگیا تھا۔

بنگلا دیش کو پارٹنرز منتخب کرنے کا حق حاصل ہے اور بھارت کو بھی تبدیلیوں کا جائزہ لے کر اپنی سلامتی یقینی بنانے کے لیے بھرپور تیاریاں کرنے کا حق حاصل ہے۔ بنگلا دیش کو مکہ معاہدہ کا حصہ بننے کے حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اُس کی مرضی کا معاملہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ مکہ معاہدہ کا حصہ بننے سے اُس کی سلامتی کا تحفظ واقعی پوری طرح ممکن ہو سکے گا یا پھر بھارت کے ساتھ موجودہ سیاس بحران ایک حقیقی اسٹریٹجک ڈراؤنے خواب میں تبدیل ہو جائے گا۔

(پُرنا لال چکمہ کا تعلق بنگلا دیش کے پہاڑی علاقے چٹاگانگ سے ہے۔ وہ مسیحی ہیں اور ۱۴؍سال تک مختلف گرجا گھروں میں پاسٹر کی حیثیت سے کام کیا ہے۔ جہادی تنظیموں کا باریک بینی سے مشاہدہ کرتے رہے ہیں۔ آج کل وہ جاپان کے دارالحکومت ٹوکیو میں سکونت پذیر ہیں اور ٹریول بلاگر ہیں۔)

(مترجم: محمد ابراہیم خان)

"Could Bangladesh joining the Makkah pact deepen its crisis with India?" ("timesofisrael.com". Aug 23, 2026)

* * *

نیپال: ہمالیائی خطّے کو قدرت کی تنبیہ

افتخار گیلانی

نیپال کے مناظر نے ہر شخص کے رونگٹے کھڑے کر دیے ہیں۔ پوری کی پوری بستی مٹی اور ملبے تلے غائب ہو چکی ہے۔ اس تباہی کا شاید سب سے زیادہ تشویشناک پہلو یہ ہے کہ اس خطرے کی نوعیت سے کبھی کوئی بے خبر نہیں تھا۔

سائنسدان، ماہرینِ ماحولیات اور پہاڑی آبادیاں برسوں سے متنبہ کر رہی ہیں کہ ہمالیہ کوئی عام پہاڑی سلسلہ نہیں ہے جس پر بغیر کسی انجام کی پروا کیے سڑکیں، سرنگیں، ہوٹل، پن بجلی کے منصوبے، فوجی تنصیبات، زیارت گاہوں کی سہولیات اور پھیلتی ہوئی بستیاں لامتناہی طور پر مسلط کی جاتی رہیں۔

ہمالیہ نوعمر پہاڑ ہونے کی وجہ سے ارضیاتی طور پر متحرک، انتہائی ڈھلوان دار، خستہ حال اور کسی بھی قسم کی چھیڑ چھاڑ کے لیے غیر معمولی حد تک حساس ہے۔

ماحولیاتی تبدیلی اب شدید بارشوں، تیزی سے بدلتے گلیشیرز، گلیشیائی جھیلوں اور بلندی پر موجود زمین کے پگھلاؤ کے ذریعے اس میں عدم استحکام کی ایک اور تہہ شامل کر رہی ہے۔

چنانچہ نیپال میں جو کچھ ہوا، اُسے محض ایک اور قدرتی آفت کے بجائے ایک ایسے پہاڑی سلسلے کی جانب سے تازہ ترین تنبیہ کے طور پر دیکھا جانا چاہیے جس کے انتباہات کا اعتراف ہم تباہیوں کے فوراً بعد کرتے ہیں اور ملبہ ہٹتے ہی انہیں فراموش کر دیتے ہیں۔

بھارت اور پاکستان کے لیے اس انتباہ نے اب غیر معمولی فوری اہمیت اختیار کر لی ہے۔ ۲۸/اگست کو 'نیچر' گروپ کے جریدے 'سائنٹفک رپورٹس' میں شائع ہونے والی ایک اہم سائنسی تحقیق نے جموں و کشمیر میں لینڈ سلائیڈنگ کے خطرات کے حوالے سے شاید سب سے واضح اور تازہ ترین جائزہ پیش کیا ہے۔

چونکہ ہمالیہ کا ایک بڑا حصہ جموں و کشمیر سے وابستہ ہے، اس لیے اس کے نتائج بھارت اور پاکستان کے پالیسی سازوں کے لیے لازمی مطالعہ ہونے چاہئیں۔

جموں یونیورسٹی کے اوتار سنگھ جسروٹیا کی قیادت میں محققین نے تقریباً ۴۳ ہزار مربع کلومیٹر رقبے کا جائزہ لیا اور سیٹلائٹ تصاویر، ریموٹ سینسنگ، زمینی مشاہدات اور جیوگرافیکل انفارمیشن سسٹم (جی آئی ایس) کی تکنیکوں کا استعمال کرتے ہوئے لینڈ سلائیڈنگ کے ۶۶۹ واقعات کی ایک تفصیلی فہرست تیار کی۔

زیرِ مطالعہ علاقے کا تقریباً ۲۴ء۴۳ فیصد حصہ لینڈ سلائیڈنگ کے شدید خطرے کے زمرے میں آتا ہے اور مزید ۳ء۶۵ فیصد انتہائی شدید زمرے میں ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو زیرِ جائزہ خطے کا ۲۸ فیصد سے زیادہ رقبہ لینڈ سلائیڈنگ کے شدید یا انتہائی شدید خطرے کی زد میں ہے۔ مزید ۵۱ء۵۶ فیصد حصہ درمیانے درجے کے خطرے کے زمرے میں آتا ہے، جبکہ صرف ۱ء۵۴/ فیصد رقبے کو بہت کم خطرے کے حامل علاقے کے طور پر شمار کیا گیا۔

دوسرے لفظوں میں، خطرہ جموں و کشمیر کے جغرافیے میں کوئی استثنیٰ نہیں بلکہ اس کی بناوٹ میں ہی سرایت کیے ہوئے ہے۔

محققین نے رام بن، ڈوڈہ، کشتواڑ، پونچھ اور راجوری میں خاص طور پر سنگین خطرات کے حامل جھرمٹوں کی نشاندہی کی ہے۔ سب سے زیادہ حساس علاقوں میں سے کئی علاقے اہم مواصلاتی راہداریوں کے ساتھ واقع ہیں، جن میں قومی شاہراہ ۴۴، قومی شاہراہ ۲۴۴، این ایچ-۱۴۴/اے، مغل روڈ اور کشتواڑ-کیلانگ روڈ شامل ہیں۔

یہ کوئی غیر معروف پہاڑی پگڈنڈیاں نہیں ہیں بلکہ وہ شریانیں ہیں جن کے ذریعے عوام، سامان، سیاح، یاتری اور سکیورٹی اہلکار نقل و حرکت کرتے ہیں۔ حالیہ برسوں میں ان میں سے کئی سڑکوں کو کافی حد تک چوڑا یا بہتر کیا گیا ہے۔

یہیں پر ایک بے چین کر دینے والی حقیقت سامنے آتی ہے۔ محققین نے آٹھ بڑے عوامل کا جائزہ لیا۔ ان میں زمین کی ڈھلوان، سمت، بلندی، ارضیات، ارضیاتی ساخت، زمین کا استعمال اور نباتاتی احاطہ، چشموں اور ندی نالوں سے قربت، اور سڑکوں سے قربت شامل ہے۔

ان کے ماڈلنگ کے تجزیے نے بار بار یہ ثابت کیا کہ سڑکوں سے قربت، ڈھلوان اور آبی گزرگاہوں سے نزدیکی، لینڈ سلائیڈنگ کی پیش گوئی کرنے والے سب سے مضبوط اشاریوں میں شامل ہیں۔

لہٰذا، پہاڑوں میں سڑکوں کی تعمیر محض ایک ایسے ماحول میں وقوع پذیر نہیں ہو رہی جو پہلے ہی لینڈ سلائیڈنگ کے خطرے سے دوچار ہے، بلکہ بعض مخصوص حالات میں یہ عمل اس خطرے اور حساسیت کو پیدا کرنے یا اسے مزید شدت بخشنے کا سبب بن سکتا ہے۔

مطالعے میں نوٹ کیا گیا ہے کہ شاہراہوں کی توسیع قدرتی ڈھلوانوں کو درہم برہم کر دیتی ہے۔

پہاڑی کناروں کو کاٹنے، پہاڑوں کی کھدائی کرنے اور قدرتی نکاسیٔ آب کے نظام کو تبدیل کرنے سے زمین غیر مستحکم ہو سکتی ہے۔ سڑکوں کے پشتے پانی کے بہاؤ کا رخ بدل سکتے ہیں، جس سے کٹاؤ اور ریلوں میں اضافہ ہوتا ہے۔

محققین نے اپنے جائزے کے ایک حصے میں ڈھلوان کو سب سے زیادہ اہمیت دی، جبکہ سڑکوں کی قربت کو بھی خاطر خواہ وزن دیا گیا۔

یہ رشتہ اُس وقت اور بھی واضح ہو گیا جب محققین نے اپنے ماڈل کا موازنہ لینڈ سلائیڈنگ کے اصل مقامات سے کیا۔ نقشے پر درج کی گئی لینڈ سلائیڈنگ کے حیرت انگیز طور پر ۸۷ فیصد واقعات انہی علاقوں میں پیش آئے جنہیں شدید یا انتہائی شدید خطرے کے حامل علاقوں کے طور پر درجہ بند کیا گیا تھا۔

اس تحقیق کے ضلعی سطح کے مشاہدات انتہائی چشم کشا ہیں۔ رام بن کے پرنوٹ میں ایک بڑے لینڈ سلائیڈ نے مکانات اور سڑکوں کو نقصان پہنچایا اور ریاسی کی طرف رابطہ منقطع کر دیا۔ ڈوڈہ کے ٹھاٹھری نئی بستی میں تودے گرنے سے مکانات اور بنیادی ڈھانچہ تباہ ہو گیا۔ اودھم پور اور بانہال کے درمیان این ایچ-۴۴ پر، جو جموں کو وادی کشمیر سے ملانے والی بنیادی سڑک ہے، لینڈ سلائیڈنگ کے متعدد واقعات دستاویزی شکل میں درج کیے گئے۔ کشتواڑ میں این ایچ-۲۴۴ اور کشتواڑ-کیلانگ روڈ کے ساتھ لینڈ سلائیڈنگ ریکارڈ کی گئی۔

پونچھ میں مغل روڈ کے ساتھ لینڈ سلائیڈنگ نے شوپیاں کے ساتھ رابطے کو بار بار متاثر کیا۔ بارہمولہ میں اوڑی-کمان پوسٹ روڈ اور دیگر راستوں پر لینڈ سلائیڈنگ ریکارڈ کی گئی، جبکہ اننت ناگ میں سنتھن ٹاپ کی طرف این ایچ-۲۴۴ پر ڈھلوانیں گرنے کے واقعات دیکھے گئے۔

سائنسدانوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ سڑکوں کے قریب لینڈ سلائیڈ کے شکار علاقوں کے جھرمٹ اس بات کو اجاگر کرتے ہیں کہ کھدائی، پہاڑیوں کی کٹائی اور نباتات کے خاتمے کے ذریعے ڈھلوانوں کو غیر مستحکم کرنے میں انسانی سرگرمیوں کا کتنا بڑا ہاتھ ہے۔ وہ خبردار کرتے ہیں کہ پہاڑی خطوں میں بنیادی ڈھانچے کی توسیع خطرے کو نمایاں طور پر

بڑھا سکتی ہے، تاوقتیکہ اس کے ساتھ محتاط منصوبہ بندی اور نقصانات سے بچاؤ کے اقدامات نہ کیے جائیں۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہمالیہ میں سڑکیں نہ بنائی جائیں۔ پہاڑی بستیوں کو رابطے کی ضرورت ہے۔ دور دراز اضلاع کو اسپتالوں، اسکولوں، منڈیوں اور قابلِ اعتماد ٹرانسپورٹ کی حاجت ہے۔ لیکن پہاڑوں میں بنیادی ڈھانچا تعمیر کرنے اور پہاڑ پر غالب آنے کی کوشش کرنے کے درمیان زمین آسمان کا فرق ہے۔

نیپال کی تباہی میں کشمیر کے لیے ایک واضح پیغام ہے۔ آج سے تیس سال پہلے اسی مہینے جنوبی کشمیر میں امرناتھ یاترا کے لیے جانے والے ہندو یاتریوں کو اگست ۱۹۹۶ء میں غیر متوقع شدید خراب موسم، بھاری برفباری اور برفانی طوفانوں کا سامنا کرنا پڑا۔

یاترا کے راستے اور اس کے آس پاس سے بالآخر ۲۶۰ سے زائد لاشیں برآمد ہوئیں۔ وہاں صرف موسم کی سختی نے ہی جانیں نہیں لیں، بلکہ ہجوم، ناقص ضابطہ کاری، پناہ گاہوں کی قلت، کمزور مواصلاتی نظام، ناکافی پیش گوئی اور انتہائی خطرناک حالات میں بیک وقت بے پناہ لوگوں کا اکٹھا ہو جانا بھی اس کا سبب بنا۔

سابق بیوروکریٹ نتیش سین گپتا کی سربراہی میں قائم تحقیقاتی کمیٹی نے بعد ازاں اس راستے کے خوفناک حالات قلمبند کیے۔ ایک موقع پر تقریباً ۷۰ ہزار یاتری شدید برفباری اور تیز ہواؤں کے دوران ایک انتہائی تنگ اور پُرخطر پہاڑی راہداری میں پھنسے ہوئے تھے یا حرکت کر رہے تھے۔ سین گپتا نے بیان کیا کہ کس طرح نڈھال یاتری بیٹھتے ہی جم کر رہ گئے، جبکہ دیگر ہجوم اور خچروں کی افراتفری کے دوران کھائیوں میں گر گئے۔

کمیٹی نے سفارش کی تھی کہ کسی بھی دن چندن واڑی سے آگے ایک مخصوص قلیل تعداد سے زیادہ یاتریوں کو جانے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ کسی خطے کی سڑکوں، عمارتوں، گاڑیوں، کچرے اور انسانوں کو جذب کرنے کی صلاحیت محض اس لیے لامحدود نہیں ہو سکتی کہ ٹیکنالوجی نے اس توسیع کو ممکن بنا دیا ہے۔

ذرا سوچیے کہ تیس سال بعد ہم کہاں کھڑے ہیں۔ امرناتھ یاترا ۲۰۲۶ء کا آغاز ۳ جولائی کو ہوا تھا اور اسے ۲۸؍اگست تک جاری رہنا تھا۔ ۹؍اگست کو جب حکام نے بارشوں کی وجہ سے پہلگام۔ چندن واڑی اور بال تل، دونوں راستوں کے حساس حصوں کو پہنچنے والے نقصان کے پیشِ نظر یاترا کو عارضی طور پر معطل کیا، تب تک ۴ لاکھ ۸۰ ہزار سے زائد یاتری پہلگام کی بلندیوں میں واقع غار میں قائم مندر کے درشن کر چکے تھے۔

کسی مذہبی یاترا کو سہولت فراہم کرنے میں کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ہے۔ مقدس مقام کی زیارت کا عقیدت مندوں کا حق تحفظ کا مستحق ہے۔ لیکن کسی زیارت کا تحفظ کرنا اور اس میں ایک مخصوص نظریہ کو تھوپنے کے نام پر لوگوں کی تعداد کو اندھا دھند بڑھاتے جانا ایک ہی چیز نہیں ہے۔

درحقیقت، حکومتیں یاتریوں کی سب سے بڑی خدمت یہ کر سکتی ہیں کہ وہ اس بات کو یقینی بنائیں کہ سیاسی وقار، سیاحت کے اہداف یا حاضری کے ریکارڈ کبھی بھی حفاظت اور ماحولیات پر غالب نہ آنے پائیں۔ ہمالیہ کوئی اسٹیڈیم نہیں ہے جہاں کامیابی کا پیمانہ محض لوگوں کی حاضری ہو۔ یہ وہ سبق تھا جسے ۱۹۹۶ء کے بعد پالیسی کا مستقل حصہ بن جانا چاہیے تھا۔

لینڈ سلائیڈنگ کشمیر کے ہمالیائی خطرات کا صرف ایک حصہ ہے۔ اس خطے میں گلیشیرز اور گلیشیائی جھیلیں بھی موجود ہیں جن کا رویہ درجہ حرارت بڑھنے کے ساتھ ساتھ تبدیل ہو رہا ہے۔

بھارت کے مرکزی آبی کمیشن نے حال ہی میں ہمالیائی خطے میں اپنے مانیٹرنگ پروگرام کو غیر معمولی وسعت دی ہے۔ جون ۲۰۲۵ء سے، وہ ۱۰؍ہیکٹر سے بڑی ۲,۸۴۳ گلیشیائی جھیلوں اور آبی ذخائر کی نگرانی کر رہا ہے، جبکہ پہلے یہ تعداد ۹۰۲ تھی۔

اس فہرست میں جموں و کشمیر کی ۷۶ گلیشیائی جھیلیں اور ۱۶؍دیگر آبی ذخائر شامل ہیں۔ لیکن صرف سیٹلائٹ کے ذریعے مشاہدہ کرنا ہی مکمل قبل از وقت انتباہی نظام نہیں بن سکتا ہے۔ اس کے لیے حکومت کو مخصوص زونز میں تعمیرات کو روکنے، سیاحوں و یاتریوں کی غیر تعداد کو محدود کرنے، غیر مستحکم ڈھلوان پر ہوٹلوں کی تعمیر کی اجازت نہ دینے اور پہاڑی سڑک کو چوڑا کرنے کے لیے بارود کے استعمال کو روکنے کے اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔

جموں و کشمیر کے بارے میں کی جانے والی نئی تحقیق واضح طور پر ڈھلوانوں کے تحفظ، سڑکوں کی کنٹرولڈ تعمیر اور مسلسل نگرانی کے ذریعے شدید اور انتہائی شدید خطرے والے علاقوں پر فوری توجہ دینے کی سفارش کرتی ہے۔

اس کے مطابق درمیانے خطرے والے علاقوں میں ترقیاتی کاموں سے قبل محتاط منصوبہ بندی اور ماحولیاتی اثرات کے جائزے کی ضرورت ہے۔ سڑکوں کے حوالے سے اس کا انتباہ خصوصی توجہ کا مستحق ہے کیونکہ پورے ہمالیہ میں بنیادی ڈھانچے کی پالیسی اس کے بالکل برعکس سمت میں جا رہی ہے۔

ہمالیہ کی ہر آفت کے بعد ماحولیاتی تبدیلی کو موردِ الزام ٹھہرانا آسان لگتا ہے۔ ماحولیاتی تبدیلی بلاشبہ خطرے کی نوعیت کو بدل رہی ہے۔ لیکن ماحولیاتی تبدیلی کو ناقص منصوبہ بندی کا بہانہ نہیں بننا چاہیے۔

اگر بارشیں شدید تر ہو رہی ہیں، تو غیر مستحکم ڈھلوانوں کو کاٹنا کم خطرناک نہیں بلکہ مزید خطرناک ہو جاتا ہے۔ جموں یونیورسٹی کے محققین تسلیم کرتے ہیں کہ لینڈ سلائیڈنگ ایک پیچیدہ مظہر ہے جس میں ارضیات، جیومورفولوجی، ہائیڈرولوجی اور انسانی دخل اندازی سبھی شامل ہیں۔ ان کے ماڈل کی بھی کچھ حدود ہیں۔ بارش اور زلزلوں کے بارے میں ہائی ریزولوشن ڈیٹا اب بھی ناکافی ہے، اور چھوٹی لینڈ سلائیڈنگز سیٹلائٹ کی گنتی سے بچ نکلتی ہیں۔

اگست ۱۹۹۶ء کے امرناتھ سانحے اور اگست ۲۰۲۶ء میں نیپال میں برپا ہونے والی تباہی کے درمیان ایک تکلیف دہ تسلسل موجود ہے۔ نیپال کے المیے کو محض دل دہلا دینے والی تصاویر کا ایک اور سلسلہ نہیں بننا چاہیے جو خبروں کا رخ بدلتے ہی عوامی حافظے سے محو ہو جائے۔

اس کے بجائے جنوبی ایشیا کے ممالک کو اس بات پر آمادہ کرانا چاہیے کہ وہ علاقائی آفات سے نمٹنے کے لیے ’سارک‘ کو ایک مؤثر پلیٹ فارم کے طور پر از سرِ نو فعال کرے۔ گلیشیرز، بادل پھٹنے کے واقعات، لینڈ سلائیڈنگ اور دریا کسی قومی سرحد کو تسلیم نہیں کرتے ہیں۔ ہمالیہ کے ایک حصے میں شروع ہونے والی آفت سیکڑوں کلومیٹر دور دوسرے ملک کی آبادیوں کو خطرے میں ڈال سکتی ہے۔

لہٰذا، سارک کو موسمیاتی، ہائیڈرولوجیکل، زلزلہ جاتی اور سیٹلائٹ معلومات کے حقیقی وقت میں تبادلے کے لیے مستقل علاقائی طریقہ کار قائم کرنا چاہیے۔ بھارت کے موجودہ وزیرِاعظم نریندر مودی حکومت نے سارک کو غیر فعال بنا کر رکھ دیا ہے، اس کو اپنے رویّے پر نظرِ ثانی کرنی چاہیے۔

رکن ممالک کے موسمی اسٹیشنز، دریاؤں کے پیمانے، گلیشیائی جھیلوں کی نگرانی کے نظام اور دیگر سینسرز ایک مشترکہ ہمالیائی ارلی وارننگ نیٹ ورک سے جڑ سکتے ہیں، جس سے آفات کے پھوٹنے سے پہلے ہی حکومتوں اور حساس بستیوں تک انتباہات پہنچنا ممکن ہو سکے گا۔ اس تعاون کو سارک سے

آگے بھی پھیلانا ہوگا۔ چین اس عمل میں ناگزیر ہے کیونکہ ہمالیہ اور تبت کے بیشتر سرچشمے اسی کے علاقے میں واقع ہیں۔ سارک، چین اور بین الاقوامی ایجنسیوں کے ساتھ مل کر ڈیٹا کے باضابطہ تبادلے کا ایک منظّم فریم ورک تیار کرسکتا ہے۔

ایک ایسے ہمالیائی مانیٹرنگ گرڈ کا فریم ورک بنانے کی ضرورت ہے، جو قراقرم اور کشمیر سے لے کر ہماچل، اترا کھنڈ، نیپال اور بھوٹان سے ہوتا ہوا مشرقی ہمالیہ تک پھیلا ہو۔ زیادہ خطرے والے گلیشیرز پر خودکار سینسر لگے ہوں۔ گلیشیائی جھیلوں کی سیٹلائٹ اور زمینی آلات کے ذریعے مسلسل نگرانی کی جارہی ہو۔

جموں وکشمیر کے لیے تیار کیے گئے حساسیت کے نقشوں کو سڑکوں کی منصوبہ بندی، سیاحتی پالیسی، یاترا کے انتظام اور تعمیراتی اجازت ناموں میں باقاعدہ شامل کیا جائے۔ اگر جنوبی ایشیائی حکومتیں ہزاروں انسانی جانوں کو بچانے والی معلومات کے تبادلے کے لیے سیاسی اختلافات اور اپنی اَنا کو کنارے نہیں کرسکتی ہیں تو ان کو ہمالیہ کی تباہیوں سے کوئی بچا نہیں سکے گا۔ بقول اقبال؛

زمین کو فراغت نہیں زلزلوں سے
نمایاں ہیں فطرت کے باریک اشارے
ہمالہ کے چشمے ابلتے ہیں کب تک
خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے

(بحوالہ: “دی وائر اردو ڈاٹ کام”۔ ۲؍ستمبر ۲۰۲۶ء)

* * *

بقیہ: مصنوعی ذہانت اور فلسطینی بیانیے کی نئی جنگ!

اب نئی سرحد الگورتھمز ہیں۔ اگر مقصد ایسی متبادل بیانیہ تشکیل دینا ہو جس میں حقائق غائب ہو جائیں، متنازع دعوے متفقہ حقیقت کے طور پر پیش ہونے لگیں اور فلسطینی تجربات کو نظرانداز یا نئے انداز میں بیان کیا جائے، تو یہ میدانِ جنگ پہلے سے کہیں زیادہ وسیع اور خطرناک ہو چکا ہے۔

ممکن ہے کہ سب سے زیادہ پیچیدہ اور خطرناک پروپیگنڈا وہ نہ ہو جسے ہم فوراً پروپیگنڈا کے طور پر پہچان لیں، بلکہ وہ معلومات ہوں جنہیں مصنوعی ذہانت کا نظام پورے اعتماد کے ساتھ غیر جانبدار حقیقت کے طور پر ہمارے سامنے پیش کرے۔

(مترجم: محمودالحق صدیقی)

"Israel takes its war on Palestine into the AI age." ("aljazeera.com". Sep 4, 2026)

* * *

کشمیر: آئینی تغیرات، جمہوری تعطل اور پسپائی!

افتخار گیلانی

ہندوستانی حکومت کی جانب سے آئین کی دفعہ ۳۷۰ کے مندرجات کی منسوخی، اور ریاست جموں وکشمیر کو دو مرکز کے زیرِ انتظام علاقوں میں تقسیم کرنے کے سات سال بعد ہندوستانی سول سوسائٹی سے وابستہ افراد پر مشتمل ایک گروپ نے حال ہی میں خطے کی زمینی صورتحال کا انتہائی تاریک اور تشویشناک نقشہ پیش کیا ہے۔

‘فورم فار ہیومن رائٹس ان جموں اینڈ کشمیر’ نامی اس گروپ کا کہنا ہے کہ سیکورٹی میں بہتری تو آئی ہے، مگر ۵؍اگست ۲۰۱۹ء کے اقدامات جمہوری حکمرانی، ادارہ جاتی احتساب اور عوامی اعتماد کو بحال کرنے میں یکسر ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس، جموں وکشمیر بدستور سیاسی بے یقینی، سکڑتی ہوئی شہری آزادیوں اور حکمرانی کے بحران کے دلدل میں پھنسا ہوا ہے۔

اگر اس گروپ میں روایتی انسانی حقوق کے علمبردار یا صحافی شامل ہوتے، تو یہ قیاس کیا جا سکتا تھا کہ وہ اپنی عادت کے تحت سوال اٹھا رہے۔ مگر اس فورم کی مشترکہ صدارت ہندوستان کے سابق مرکزی داخلہ سکریٹری گوپال پلئی اور حکومت کے جموں وکشمیر کے لیے مقرر کردہ سابق ثالثین کے گروپ کی رکن رادھا کمار کررہی ہیں۔

اس کے اراکین میں سپریم کورٹ کی سابق جج جسٹس روما پال؛ دہلی اور مدراس ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس اے پی شاہ؛ اڑیسہ ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس جسٹس بلال نازکی؛ جموں وکشمیر ہائی کورٹ کے سابق جج جسٹس حسنین مسعودی؛ قومی کمیشن برائے انسانی حقوق کے سابق سکریٹری جنرل پر بیر سین؛ معروف مؤرخ رام چندر گہا؛ قومی کمیشن برائے تحفظ حقوقِ اطفال کی سابق چیئرپرسن شانتا سنہا؛ سینئر ریٹائرڈ فوجی افسران بشمول لیفٹیننٹ جنرل ایچ ایس پناگ، میجر جنرل اشوک مہتا اور ایئر وائس مارشل کپل کاک، کے ساتھ ساتھ ممتاز وکلا، ماہرین تعلیم اور حقوق انسانی کے سرگرم کارکن شامل ہیں۔

آئینی تغیرات کی ساتویں سالگرہ کے موقع پر جاری کردہ فورم کی ۶۰ صفحات پر محیط رپورٹ، بعنوان “جموں اینڈ کشمیر: سیون ایئرز انڈر یونین رول” میں شہریوں کے تحفظ، سیاسی و معاشی حقوق، آزادی اظہارِ رائے، خواتین اور بچوں کے حقوق، اور لداخ کے حالات کا باریک بینی سے جائزہ لیا گیا ہے اور پہلی بار اس میں پاکستان کے زیرِانتظام جموں و کشمیر کے حالات و واقعات پر بھی ایک علیحدہ تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

رپورٹ کا آغاز اس امر کے اعتراف سے ہوتا ہے کہ عسکریت پسندی سے جڑے تشدد کے واقعات میں گزشتہ برسوں کے تقابل میں کمی واقع ہوئی ہے۔ تاہم، رپورٹ خبردار کرتی ہے کہ سکیورٹی میں بہتری کو کسی طور بھی سیاسی معمول سے تعبیر نہیں کیا جانا چاہیے۔

رپورٹ کے مطابق، سیاسی صورتحال بدستور غیر مستحکم اور بے یقینی کا شکار ہے۔ گزشتہ سال کے دوران منتخب عوامی نمائندوں اور ۲۰۱۹ء کے بعد قائم کردہ انتظامی ڈھانچے کے مابین خلیج وسیع ہوگئی ہے۔

اگرچہ جموں وکشمیر میں اب وزیرِ اعلیٰ عمر عبداللہ کی سربراہی میں ایک منتخب عوامی حکومت موجود ہے، لیکن حقیقی اور بااختیار اقتدار بدستور لیفٹیننٹ گورنر کے دفتر ہی میں مرتکز ہے۔ جو عوام کے سامنے جوابدہ نہیں ہیں۔ جو عوام کے سامنے جوابدہ ہے، اس کے پاس حکمرانی کے اختیارات برائے نام یا سرے سے ناپید ہیں۔

اس رپورٹ کی ایک خالق اور سابق مذاکرات کار رادھا کمار کا کہنا ہے کہ ریاستی درجے کی بحالی میں بلا جواز تاخیر نے جمہوری احتساب کی بنیادیں ہلا دی ہیں، حکمرانی کو مفلوج کر دیا ہے اور عوام میں بیگانگی کے احساس کو مزید گہرا کر دیا ہے۔

انہوں نے یاد دلایا کہ وزیرِ اعظم نریندر مودی کی حکومت نے پارلیمنٹ اور سپریم کورٹ دونوں کے سامنے بارہا جموں و کشمیر کو ریاست کا درجہ لوٹانے کی باضابطہ یقین دہانی کرائی تھی، مگر وہ تمام وعدے تاحال پورے نہیں کیے گئے۔

ان کا کہنا ہے کہ دفعہ ۳۷۰ کو پہلے انتظامی و صدارتی احکامات کے ذریعے کھوکھلا کیا گیا اور پھر پارلیامانی قانون سازی کے بلڈوزر سے زمین بوس کر دیا گیا۔ جس نے ہندوستان کے پورے وفاقی نظام اور جمہوری روایات کی

بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔

رادھا کمار نے سکیورٹی کے اس جواز کو بھی چیلنج کیا کہ خطے میں جاری عسکریت پسندانہ حملے ریاستی درجے کی بحالی میں تاخیر کا جواز بن سکتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ اس کے برعکس سکیورٹی کے بے رحمانہ اور سخت گیر اقدامات اختیار کرنا، اور پی ایس اے اور یو اے پی اے جیسے کالے قوانین کے تحت شہریوں کو جیلوں میں ٹھونسنا دراصل مزید تشدد کو جنم دینے کی ضمانت ہے۔

انہوں نے کہا کہ اس چیلنج سے نمٹنے کا راستہ کشمیری عوام کے حقوق غصب کرنے کے بجائے دو ہی صورتوں میں ممکن ہے: یا تو پاکستان کے ساتھ تعلقات میں بہتری لائی جائے یا پھر ایک ناقابلِ تسخیر سکیورٹی ڈیٹرنس قائم کیا جائے۔ رادھا کمار کے مطابق حکومت ان دونوں محاذوں پر مکمل ناکام رہی ہے۔

اگرچہ خطے میں ۲۰۲۴ء میں اسمبلی انتخابات منعقد ہو چکے ہیں، مگر ان کا استدلال ہے کہ منتخب حکومت کے پاس کوئی معنی خیز اختیارات سرے سے موجود نہیں۔ 'ٹرانزیکشن آف بزنس رولز ۲۰۲۴' کے تحت سول انتظامیہ، پولیس، سرکاری وکلا اور اب ٹیلی مواصلات سے متعلق ہنگامی اختیارات بھی مکمل طور پر لیفٹیننٹ گورنر کے کنٹرول میں دے دیے گئے ہیں۔

انہوں نے بتایا کہ جموں و کشمیر ہائی کورٹ نے ضمانتیں منظور کرتے ہوئے پبلک سیفٹی ایکٹ (پی ایس اے) اور غیر قانونی سرگرمیوں کی روک تھام کے ایکٹ (یو اے پی اے) کے غلط استعمال پر بارہا کڑی سرزنش کی ہے۔ لیکن حکومت کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ رپورٹ عدلیہ کی اس بڑھتی ہوئی مداخلت کو حقوقِ انسانی کے اس کٹھن اور بنجر منظر نامے میں امید کی چند موہوم کرنوں میں سے ایک قرار دیتی ہے۔

تاہم فورم نے متنبہ کیا کہ عدلیہ کی جانب سے ملنے والے یہ ریلیف اسی وقت سامنے آتے ہیں جب مظلوم شہری اپنی زندگی کے قیمتی سال جیل کی سلاخوں کے پیچھے سڑ کر گنوا چکے ہوتے ہیں۔

رپورٹ میں احتیاطی نظر بندی کے قوانین کے مسلسل غلط استعمال کو دستاویزی شکل دی گئی ہے۔ رپورٹ میں سوپور کے اس واقعے کا حوالہ دیا گیا ہے جہاں ایک اسکول کی طالبہ کی مبینہ جنسی بے حرمتی کے خلاف سڑکوں پر نکلنے والے مظاہرین کو پابندِ سلاسل کیا گیا، روزمرہ امن و امان کے معمولی مسائل میں پی ایس اے کے نفاذ کی نشاندہی کی گئی، اور رواں سال کے اوائل میں ایران کے سپریم لیڈر آیت اللہ علی خامنہ ای کے قتل کے بعد وادی بھر میں نکلنے والے پرامن جلوسوں پر یو اے پی اے کی دفعات لگانے کا احاطہ کیا گیا۔

رپورٹ کے مطابق وادی بھر میں ان مظاہروں کے بعد لگ بھگ ۵۰ نوجوانوں پر دہشت گردی کے سخت قوانین کے تحت مقدمات درج کیے گئے۔ اس کے علاوہ فورم نے شوپیاں میں واقع دینی و عصری تعلیمی ادارے 'جامعہ سراج العلوم' کی بندش پر بھی گہری تشویش کا اظہار کیا، جسے حکام نے یو اے پی اے کے تحت ایک ''غیر قانونی تنظیم'' قرار دے کر تالا لگا دیا۔

رپورٹ بتاتی ہے کہ اس اچانک فیصلے سے تقریباً ۶۰۰ بے قصور طلبہ کا تعلیمی مستقبل تاریک ہو گیا، جبکہ اس کارروائی کی وجوہات اور بنیادوں کو عوام کے سامنے ظاہر تک نہیں ہونے دیا گیا۔

نومبر ۲۰۲۵ء میں دلی کے تاریخی لال قلعہ کے باہر ہونے والے بم دھماکے کے بعد پیش آنے والے تشویشناک حالات پر رپورٹ میں تفصیلی توجہ دی گئی ہے۔ دھماکے کے چند ہی گھنٹوں کے اندر سوشل میڈیا پر کشمیریوں کے خلاف افواہوں اور زہریلے، اشتعال انگیز پیغامات کا طوفان آ گیا۔ ملک کے مختلف شہروں میں مقیم کشمیری طلبہ، تاجروں اور ملازمت پیشہ افراد کو رہائش گاہوں سے جبری بے دخلی، کرایہ پر مکان دینے سے انکار، پولیس ویری فکیشن کے نام پر تذلیل، مکان مالکان کے جارحانہ رویے اور کام کی جگہوں پر ہراسانی کا سامنا کرنا پڑا۔

جامعات کو ہدایت کی گئی کہ وہ اپنے ہاں زیرِ تعلیم تمام کشمیری طلبہ کا مکمل نجی ڈیٹا اکٹھا کریں، جبکہ گڑگاؤں پولیس نے مکان مالکان اور رہائشی سوسائٹیوں کو باضابطہ احکامات جاری کیے کہ وہ جموں و کشمیر سے تعلق رکھنے والے اپنے تمام کرایہ داروں کی تفصیلی فہرستیں فوری جمع کرائیں۔

فورم نے حکومت کے سرد مہر رویے پر کڑی تنقید کی ہے۔ رپورٹ کا استدلال ہے کہ ماضی کے برعکس جب بڑے حملوں کے بعد مرکزی وزارت داخلہ ملک بھر میں کشمیری طلبہ کے تحفظ کے لیے فوری ایڈوائزریاں جاری کیا کرتی تھی، اس بار ایسا کوئی بھی حفاظتی یا احتیاطی اقدام نہیں اٹھایا گیا۔

اس کے برعکس، رپورٹ کے مطابق بعض مقامات پر خود سرکاری اقدامات نے شکوک و شبہات اور خوف کے اس زہریلے ماحول کو مزید تقویت بخشی۔ خود جموں و کشمیر کے اندر، لال قلعہ دھماکے کے بعد کم از کم ۵۰۰؍افراد کو تھانوں میں بلا کر گھنٹوں سخت تفتیش کا نشانہ بنایا گیا، جبکہ امرناتھ یاترا کے دوران اننت ناگ میں پولیس کانسٹیبل عاشق حسین قریشی کی ہلاکت کے بعد وادی بھر سے ۲ ہزار سے زائد افراد کو حراست میں لیا گیا۔

فورم کے مطابق، اتنے بڑے پیمانے پر بڑے پیمانے کی گرفتاریاں یہ واضح کرتی ہیں کہ یہ کسی ٹھوس بنیاد پر ٹارگٹڈ تفتیش نہیں تھی بلکہ پولیس کی جانب سے کیا گیا ایک اندھا دھند آپریشن تھا۔ رپورٹ مزید بتاتی ہے کہ اس سال کی امرناتھ یاترا کے سکیورٹی انتظامات اب تک کی تاریخ کے سب سے سخت ترین درجے تک پہنچ گئے تھے۔ جن میں کثیر سطحی فوجی تعیناتی، نو فلائی زونز کا قیام، یاترا میں خدمات فراہم کرنے والے مقامی شہریوں کے لیے کیو آر کوڈ پر مبنی شناختی کارڈز کا لازمی اجرا، اور جموں سرینگر قومی شاہراہ پر عام شہریوں کی گاڑیوں کی آمد و رفت پر کڑی پابندیاں شامل تھیں۔

رپورٹ کہتی ہے کہ اگرچہ زائرین کا تحفظ بلاشبہ ضروری ہے، لیکن مقامی باشندوں کی اکثریت نے ان غیر معمولی بندشوں کو اپنی روزمرہ زندگی کی مسلسل عسکری ناکہ بندی اور تذلیل کے طور پر دیکھا۔

فورم نے مساجد، دینی مدارس، ائمہ کرام اور مساجد کی انتظامی کمیٹیوں کے اراکین کے وسیع ذاتی کوائف اکٹھے کرنے کی حالیہ حکومتی مہم پر بھی گہری تشویش کا اظہار کیا ہے۔ رپورٹ کے مطابق، مانگی گئی معلومات معمول کی انتظامی ضرورتوں سے کہیں زیادہ متجاوز تھیں، جس کے ردعمل میں وادی کے ممتاز دینی پلیٹ فارم 'متحدہ مجلس علما' نے اس اقدام کو شہریوں کی نجی زندگی کے تقدس اور مذہبی آزادی کے بنیادی آئینی حق پر براہِ راست حملہ قرار دیا۔

رپورٹ کے مطابق، جموں و کشمیر کی معیشت بغیر سوچے سمجھے کی جانے والی ان پالیسیوں کی تباہ کاریوں کا مسلسل شکار ہے اعداد و شمار کا حوالہ دیکر رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ قومی اوسط کے تناسب سے جموں و کشمیر کی فی کس آمدنی، جو ۲۰۱۳-۱۴ء میں ۹ء۹۷ فیصد تھی، گھٹ کر اب ۶ء۶۷ فیصد پر آ چکی ہے، یعنی اس میں ۳ء۳ فیصد پوائنٹس کی نمایاں گراوٹ درج ہوئی۔

مزید برآں، گریجویٹ نوجوانوں میں بے روزگاری کی شرح ۲۳ء۹ فیصد تک جا پہنچی ہے، جو قومی اوسط کے مقابلے میں تقریباً دوگنی ہے۔ جبکہ سیب کی صنعت، جو کشمیر کی دیہی معیشت کی ریڑھ کی ہڈی ہے، گزشتہ ایک دہائی کے بدترین بحران سے دوچار ہے۔ ایک مستحکم، بااختیار اور جوابدہ حکومت کی عدم موجودگی کی وجہ سے روزگار، سرمایہ کاری اور دیہی ترقی کے حوالے سے طویل مدتی پالیسیاں مرتب کرنا ناممکن ہو چکا ہے۔ فورم کے مطابق اس کا ناگزیر نتیجہ بالخصوص نوجوان نسل میں تیزی سے بڑھتی ہوئی مایوسی اور بیزاری کی شکل میں نکل رہا ہے۔

رپورٹ کے مطابق ۲۰۱۹ء کی آئینی تبدیلیوں کے فوراً بعد جموں و کشمیر کا ریاستی انسانی حقوق کمیشن (ایس ایچ آر سی)، خواتین کا کمیشن، احتساب کمیشن اور معلوماتی کمیشن بیک جنبشِ قلم تحلیل کر دیے گئے تھے۔ فورم کا کہنا ہے کہ اسے توقع تھی کہ منتخب حکومت کے اقتدار سنبھالنے کے بعد ان اداروں کا احیا ہو جائے گا۔ عوامی حکومت کے اقتدار سنبھالنے کے تقریباً دو سال بعد بھی، یہ ادارے بحال نہیں ہو سکے ہیں۔

جموں و کشمیر میں تاحال کوئی انسانی حقوق کمیشن وجود نہیں رکھتا، اور نہ ہی قانون ساز اسمبلی نے فورم کی بار بار کی سفارشات کے باوجود انسانی حقوق پر کوئی باضابطہ اسمبلی کمیٹی قائم کی ہے۔

اپنی گزشتہ تمام رپورٹس کے برعکس، فورم فار ہیومن رائٹس ان جموں اینڈ کشمیر نے اس بار پہلی مرتبہ پاکستان کے زیرِ انتظام جموں و کشمیر کے حالات پر ایک مکمل اور علاحدہ باب مختص کیا ہے۔

فورم کا استدلال ہے کہ خطے میں انسانی حقوق کی صورت حال کا کوئی بھی معتبر اور دیانت دارانہ جائزہ لائن آف کنٹرول کے اس پار ہونے والی پیش رفت کو نظر انداز کر کے مکمل نہیں ہو سکتا۔ مصنفین نے واضح کیا کہ ماضی کی رپورٹس میں اس خطے کو اس لیے شامل نہیں کیا جا سکا تھا کیونکہ وہاں سے مصدقہ اور غیر جانبدار معلومات کا شدید فقدان تھا اور پاکستان میں فورم جیسا کوئی ہم منصب ادارہ کام نہیں کر رہا تھا۔

تاہم، گزشتہ ایک سال کے دوران پاکستان کے زیرِ انتظام جموں و کشمیر میں اٹھنے والی عوامی مظاہروں اور تحریکوں کی بے مثال لہر نے ان حالات کا احاطہ کرنا ناگزیر بنا دیا ہے۔ لائن آف کنٹرول کے دونوں اطراف کے حالات کا احاطہ کر کے فورم نے واضح کیا ہے کہ اگرچہ دونوں جانب کا سیاسی تناظر، ملکی نظام اور اسباب مختلف ہیں، لیکن جمہوری احتساب، بااختیار عوامی نمائندہ اداروں اور شہری آزادیوں کا تڑپتا ہوا مطالبہ اس پوری منقسم ریاست کے عوام کا مشترکہ درد بن چکا ہے۔

فورم نے سفارش کی ہے کہ جموں و کشمیر کا مکمل ریاستی درجہ بلا تاخیر بحال کیا جائے اور ۲۰۱۹ء کا ری آرگنائزیشن ایکٹ فوری واپس لیا جائے۔ پولیس اور انتظامی اصلاحات کو تیز کیا جائے تاکہ پولیسنگ کو جمہوری تقاضوں کے تابع کیا جا سکے۔

پبلک سیفٹی ایکٹ (پی ایس اے) اور یو اے پی اے (یو اے پی اے) کے تحت درج تمام مقدمات اور قیدیوں کا آزادانہ عدالتی جائزہ لیا جائے اور بے بنیاد کیسز ختم کیے جائیں۔ جموں و کشمیر کے ریاستی انسانی حقوق کمیشن، خواتین کمیشن، احتساب کمیشن اور معلوماتی کمیشن کو قانون کے مطابق فی الفور دوبارہ فعال کیا جائے۔ جموں و کشمیر کی قانون ساز اسمبلی میں انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے فوری طور پر ایک بااختیار کمیٹی قائم کی جائے۔

تاہم فورم کی سب سے پرزور اپیل یہ ہے کہ جمہوری حقوق کو سکیورٹی پالیسی کی زنجیروں سے آزاد کیا جائے اور عسکریت پسندی کو ڈھال بنا کر ریاستی درجے کی بحالی کو غیر معینہ مدت کے لیے التوا میں ڈالنا خود ایک سکیورٹی خطرہ بن چکا ہے۔

پوری رپورٹ کے دوران مصنفین نے سکیورٹی کے زور پر قائم انتظامی استحکام اور عوام کے منتخب جمہوری جواز کے مابین باریک اور واضح فرق کھینچا ہے۔

رپورٹ استدلال کرتی ہے کہ حقیقی امن اور حالات کے معمول پر آنے کی واحد شرط آزاد و فعال آئینی ادارے، عوام کے سامنے جوابدہ بااختیار حکومت، عدالتی تحفظات کی بالادستی اور سلب شدہ سیاسی حقوق کی بلامشروط بحالی ہے۔

فورم کے تمام معزز اراکین اس حتمی اور اٹل نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جموں و کشمیر میں انسانی حقوق کے تحفظ، نگرانی اور جمہوری احتساب کا ایک اور صرف ایک ہی راستہ ہے: اور وہ یہ کہ جموں و کشمیر کو وہ مکمل اور باوقار درجہ بغیر کسی التوا کے لوٹایا جائے جو اگست ۲۰۱۹ء میں اس سے زبردستی چھین لیا گیا تھا۔

(بحوالہ: ”دی وائر اردو ڈاٹ کام“۔ ۱۰؍ستمبر ۲۰۲۶ء)

* * *

حوثی: میزائلوں کی تیاری کے لیے AI کا استعمال

یمنی حوثیوں کی جانب سے بیلسٹک میزائل کی تیاری کے لیے انتھروپک کا کلاڈ اے آئی استعمال کرنے کا انکشاف ہوا ہے۔

معروف امریکی ٹیکنالوجی کمپنی ’انتھروپک‘ نے انکشاف کیا ہے کہ یمنی عسکریت پسندوں نے اپنے بیلسٹک میزائلوں کے لیے گائیڈنس، کنٹرول اور نیویگیشن سافٹ ویئر تیار کرنے کی غرض سے اس کے مصنوعی ذہانت کے ماڈل ’کلاڈ اے آئی‘ کا استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔

اپنی انٹیلی جنس تھریٹ رپورٹ میں کمپنی نے براہ راست حوثیوں کا نام نہیں لیا تاہم یہ ضرور بتایا کہ اس نے ’شمالی یمن میں موجود تخریب کاروں کے ایک سیل کی نشاندہی کی ہے جو ہتھیاروں کی تیاری کے تین پروگرام چلا رہا تھا‘۔

واضح رہے کہ شمالی یمن کا بیشتر حصہ ایران کے حمایت یافتہ حوثیوں کے کنٹرول میں ہے۔

انتھروپک کے مطابق یمنی سیل نے ملٹی اسٹیج بیلسٹک میزائل، ملٹی ویریئنٹ میزائل اور گائیڈڈ راکٹ سمیت جدید ہتھیار تیار کرنے کی کوشش کی اور گائیڈنس اور کنٹرول سافٹ ویئر تیار کرنے کے لیے سافٹ ویئر انجینئرز کے بجائے ’کلاڈ کوڈ‘ کا سہارا لیا۔

کمپنی نے بتایا کہ اس کے اے آئی حفاظتی نظام نے اس سیل کی کئی درخواستوں کو بلاک کر دیا لیکن عسکریت پسندوں نے اپنے اصل مقاصد کو چھپانے کے لیے مختلف حربے استعمال کیے اور انہوں نے اپنے کام کو کئی سیشنز میں تقسیم کر دیا تاکہ کسی ایک سیشن سے ان کے مکمل ارادے کا پتا نہ چل سکے۔

رپورٹ میں مزید انکشاف کیا گیا ہے کہ اگرچہ اس بات کے کوئی شواہد نہیں کہ وہ ایک مکمل آپریشنل ڈیوائس بنانے میں کامیاب ہوئے تاہم انہوں نے ایک گائیڈڈ راکٹ کا ٹیسٹ فائر ضرور کیا تھا، بظاہر یہ ٹیسٹ ناکام رہا کیونکہ ’چند ہی گھنٹوں کے اندر وہ یہ جاننے کے لیے کلاڈ پر واپس آئے کہ راکٹ کا تجربہ کیوں ناکام ہوا‘۔

رپورٹ میں خبردار کیا گیا ہے کہ ان تخریب کاروں نے مبینہ طور پر ایک ایسا آف لائن سیمولیشن ٹول کٹ بھی بنا لیا ہے جو کلاڈ یا دیگر انجینئرنگ پلیٹ فارمز پر انحصار نہیں کرتا۔

(بحوالہ: ”جیو نیوز اردو ڈاٹ ٹی وی“۔ ۱۱؍ستمبر ۲۰۲۶ء)

* * *

بچّوں کی عادت سازی میں والدین کا کردار

ام مسفرہ مبشرہ کھوت

انسان کا دماغ ایک حیرت انگیز مشین ہے، جو ہر روز ہزاروں فیصلے کرتا ہے مگر ان میں سے اکثر وہ شعوری طور پر نہیں کرتا۔ ہم میں سے زیادہ تر لوگ دن کا بڑا حصہ عادات کے آٹو پائلٹ موڈ پر گزارتے ہیں۔ ہم پیاس لگنے پر خود بخود پانی کی طرف بڑھتے ہیں، گرمی محسوس ہو تو پنکھے کا بٹن دبا دیتے ہیں، نماز کا وقت ہوتا ہے تو جسم ازخود اٹھنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ یہی وہ نظامِ عادت ہے جو زندگی کو منظّم بناتا ہے، لیکن یہی انسان کے رک جانے، جمود کا شکار ہونے، یا نئی راہوں سے ہچکچانے کا سبب بھی بنتا ہے۔ اور اسی لیے جب ہم بچوں کی تربیت کی بات کرتے ہیں تو ''عادت سازی'' (Habit Building) محض ایک اخلاقی یا وقتی تربیتی پہلو نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق Brain Wiring سے ہے۔

ماہرِ نفسیات ڈاکٹر بروس لپٹن (Dr.Bruce Lipton) کے مطابق: ''بچے کی زندگی کا پہلا سات سالہ دَور، وہ دَور ہے جب اس کا ذہن 'ریکارڈنگ موڈ' میں ہوتا ہے، وہ شعوری طور پر نہیں سوچتا بلکہ ہر تجربہ، ہر ردعمل، ہر منظر کو اپنے لاشعور میں محفوظ کرتا ہے۔'' اور اس لیے زندگی کے ابتدائی یہ سات سال عادتیں بنانے کے لیے بہت اہم ہوتے ہیں۔ ان سات سالوں میں بچے ابتدائی باتیں سیکھ جاتے ہیں جیسے کھانا کہاں کھانا ہے، کھانا کس طرح کھانا ہے، کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھونا ہے، کپڑے کس طرح پہننے ہیں، گھر میں داخل ہوتے وقت چپل اور جوتے باہر ہی نکالنے ہیں، سونا کہاں ہے وغیرہ۔ ان ساری ابتدائی باتوں میں بچوں کو بہت زیادہ ہدایت دینے اور تاکید کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ سچ بولنا، دوسرے کی چیز لینے کی اجازت لینا، اپنی چیزوں کی حفاظت کرنا، عزت کرنا۔ یہ ابتدائی نوعیت کی اخلاقیات بھی بچے بآسانی سیکھ جاتے ہیں۔

یوں ہر عمل جو بار بار دہرایا جائے، وہ بچے کے دماغ کے نقشے میں اپنی پگڈنڈی بناتا جاتا ہے اور یہی پگڈنڈی ایک وقت کے بعد اس کی شخصیت کا راستہ بن جاتی ہے۔ یہ سب عادتیں آہستہ آہستہ دماغ کے نیورونز کے راستوں (Neural Pathways) میں درج ہو جاتی ہیں۔ ان راستوں کو مضبوط کرنے کے لیے دماغ کو تکرار (Repetition) اور جذباتی وابستگی (Emotional Connection) دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی اگر بچہ کسی عمل کو بار بار خوشی یا اطمینان کے ساتھ انجام دیتا ہے، تو دماغ اسے ''محفوظ'' کرلیتا ہے اور یہی عمل بعد میں عادت بن جاتا ہے۔ اس لیے والدین کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس 'ریکارڈنگ موڈ' کے زمانے میں ہر دن کو ایک تربیتی موقع سمجھیں، کیونکہ انھی لمحوں میں زندگی بھر کے لیے اچھی عادتیں تشکیل پاتی ہیں۔

بچوں میں اچھی عادتیں پروان چڑھانے کے لیے سب سے پہلا اصول نمونہ بننا (Modelling) ہے۔ بچہ وہ جلد نہیں سیکھتا جو آپ اسے کرنے کو ''کہتے'' ہیں، بلکہ وہ جلد سیکھتا ہے جو آپ ''کرتے'' ہیں۔ یعنی سننے سے زیادہ بچوں کا فوکس دیکھنے پر ہوتا ہے جو اسے دکھائی دیتا ہے، اسے وہ اپناتا ہے۔

اگر والدین خود نظم وضبط، صفائی، وقت کی پابندی، عمدہ گفتگو، ہمدردی اور آپسی تعاون کا مظاہرہ کریں تو بچہ ان اوصاف کو لاشعوری طور پر اپنا لیتا ہے۔ ماہرینِ نفسیات کے مطابق جب بچہ اپنے قریبی لوگوں کے کسی عمل کو بار بار دیکھتا ہے تو دماغ میں "Mirror Neurons" فعال ہو جاتے ہیں، یعنی وہ عمل صرف دیکھنے سے ہی اس کے اندر نقل ہونے لگتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ''آپ جو بنانا چاہتے ہیں، وہ پہلے خود بن جائیں، تبھی بچہ ویسا بنے گا۔''

دوسرا اہم اصول دہرانا (Repetition) ہے۔ عادت کوئی ایک دن میں نہیں بنتی۔ بچے کو بار بار ایک ہی عمل دہرانا ہوتا ہے۔ جیسے بچوں کو الفاظ سمجھانے اور یاد کرانے کے لیے نظمیں یاد کرائی جاتی ہیں اور نظمیں یاد کرنے کے لیے نظموں کو بار بار دہرایا جاتا ہے۔ بچوں میں کوئی عادت ڈالنی ہو تو بچوں کو بار بار وہ کرواتے رہیے تاکہ بچے کے ذہن کو اور اس کے جسم کے اعضا کو ایک پیٹرن کی عادت ہو جائے اور مسلسل کرنے کے بعد وہ بنا محنت کے اور بنا کاہلی کے اسے کرتا رہے۔

تیسرا اصول جذباتی وابستگی (Emotional Connection) ہے۔ بچہ جس عمل کو خوشی خوشی کرتا ہے، وہی اس کے اندر دیرپا اثر چھوڑتا ہے اور وہ اس عمل کو خود بخود دہراتا ہے۔ ایسا اُس وقت ہوتا ہے جب والدین کسی کام کو خوش دلی سے سکھاتے ہیں۔ اکثر ہوتا یوں ہے کہ جب والدین یہ سوچتے ہیں کہ انہیں بچوں کو کچھ اچھی عادتیں سکھانی ہیں تب وہ سنجیدہ ہو جاتے ہیں اور ایک پروجیکٹ کے طور پر مطلوبہ عادتوں پر فوکس کرتے ہیں اور بعض دفعہ ان کی توجہ اس بات پر ہوتی ہے کہ دوسروں کے یا ان کے ہی دوسرے بچوں نے یہ کام، عادت یا مہارت کتنی دیر میں کس طرح سیکھی اور یہ بچہ جسے ہم سکھا رہے ہیں، وہ کتنی دلچسپی لے رہا ہے۔ اب ضروری نہیں کہ ہر بچہ فوراً سیکھ جائے یا ہر بچہ ہر عادت اپنانے کے لیے فوراً تیار ہو اور تب والدین مایوس ہو جاتے ہیں۔

ہونا تو یوں چاہیے کہ جب والدین بچوں کو کچھ سکھا رہے ہیں تو انہیں اس بات کا خیال رکھنا ہے کہ انہیں وقت دینا ہوگا، وہ جلد بازی نہیں کریں۔ انہیں نتیجے کا انتظار کرنے کے بجائے سکھانے کے عمل پر فوکس رکھتے ہوئے اس عمل کو انجوائے کرنا ہوگا۔

چوتھا اصول حوصلہ افزائی (Positive Reinforcement) ہے۔ ہر انسان فطرتاً تعریف اور انعام کی چاہت رکھتا ہے۔ قرآن وسنت میں بھی اجر وثواب اور جنت کا خوب تذکرہ ملتا ہے۔ بچوں کی عمر چاہے جو ہو، اُن کی تعریف ضرور کریں۔ اس سے ان کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور ان کے سیکھنے کے عمل میں تیزی آتی ہے۔ ساتھ ہی وہ عادتیں اتنی پختہ ہو جاتی ہیں کہ بعد میں ان کے کردار کی پہچان بنتی ہیں۔

پانچواں اصول تسلسل (Consistency) ہے۔ والدین اگر اپنے بچوں کا شاندار مستقبل چاہتے ہیں تو وہ اپنی طبیعت میں استقلال لائیں اور اپنے بچوں کو استقلال سکھائیں۔ پیرنٹگ کے ابتدائی سات برسوں میں خاص طور سے والدین کو ہمت نہیں ہارنی ہے اور عادتوں کو بنانے میں مسلسل محنت کرنی ہے۔ اگر والدین بیزار ہو جاتے ہیں، سستی اور کاہلی کا شکار ہو جاتے ہیں یا بہت مشقت کے باوجود خاطر خواہ کامیابی نہیں ملنے پر مایوس ہو جاتے ہیں تو وہ کچھ دیر آرام کر سکتے ہیں یا نیا انداز اپنا سکتے ہیں لیکن انہیں رکنا نہیں چاہیے۔

بچوں کو اچھی عادتیں اپنانے کا شوق کیسے دلائیں؟

والدین کو چاہیے کہ کم سنی ہی سے بچوں کو اچھی عادتوں سے متعارف کراتے رہیں اور ان کے اندر ان عادتوں کو اپنانے کا شوق پیدا کرتے رہیں۔

اپنے روزمرہ معمولات میں اچھی عادتوں کو نمایاں رکھیں اور بچوں کے سامنے ان کا ذکر بھی کرتے رہیں، تاکہ وہ دیکھیں کہ والدین خود ان پر عمل پیرا ہیں۔

///// باقی صفحہ نمبر ٦ \\\\\

MA'ARIF FEATURE - Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950